www.allurdu.com
داستان گو
اشفاق احمد
اے حمید
BIC

اے حمید

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

اشفاق احمد نے ماڈل ٹاؤن میں اپنا جو گھر بنایا ہے اس کا نام "داستان سرائے" رکھا ہے۔ میں "داستان سرائے" کے باغیچے میں بانس کے ایک چھوٹے سے درخت کے سامنے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ بانس کی پوریاں ابھی پتلی تھیں اور ان کا رنگ زرد تھا۔ بانس کی یہ قسم ہمارے ہاں بہت کم ہوتی ہے۔ میں نے زرد بانس کے درخت برما' تھائی لینڈ کے باؤر کے جنگلوں میں دیکھے ہیں۔ پیچھے سے اشفاق احمد نے مجھے آواز دی۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "یہ بانس کا پودا تم نے کہاں سے لیا تھا؟"

وہ ہنس پڑا۔

"یہ زرد بانس ویت نام کے جنگلوں میں اگتا ہے۔ ایک نرسری سے مل گیا تھا باہر سردی ہے اندر آجاؤ۔ چائے آ رہی ہے"

اشفاق احمد نے اپنے مکان کا دیوان خانہ کافی کھلا کھلا بنایا ہے۔ باغیچے کی طرف شیشے کی لمبی دیوار ہے جو سفید جالی دار پردوں سے ڈھکی رہتی ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے میرا کئی بار دل چاہتا ہے کہ اٹھ کر پردہ ہٹاؤں اور باغیچے کو دیکھوں۔ ہم دونوں دیوان خانے میں آ کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ نوکر چائے بنانے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ میں نے خود چائے بنائی۔ چائے کا رنگ بتا رہا تھا کہ میں بہت اچھی ہوں۔ چائے واقعی اچھی تھی۔ میں نے اس کی تعریف کی تو اشفاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے آج قدسیہ نے چائے دم کی ہے"

میں نے کہا۔

"ایسی چائے کوئی باذوق خاتون ہی دم کر سکتی ہے۔ تم اور تمہارا نوکر یہ چائے تیار نہیں کر سکتا"

میں نے کاپی اور بال پوائنٹ سامنے رکھ لیا۔ سگریٹ سلگایا اور اشفاق سے کہا۔

"اب تم ان گلی کوچوں کا ذکر کرو جہاں کھیل کود کر تم نے اپنا بچپن گزارا۔ تمہارا قصبہ شہر سے کتنی دور تھا۔ کیا وہاں کوئی دریا بھی بہتا تھا؟ مجھے اپنے قصبے کے کھیتوں' امرود کے باغوں ٹاہلی کے درختوں اور تالابوں کے پاس لے چلو تاکہ میں تمہیں وہاں دوڑتے بھاگتے دیکھوں۔ تم بولتے جاؤ' مجھے جو بات نوٹ کرنی ہو گی کرتا جاؤں گا۔"

اشفاق احمد نے بتایا کہ جس قصبے میں وہ پیدا ہوا اس کا نام مکتسر تھا۔ مکتسر فیروز پور شہر سے پچاس میل دور تھا۔

"یہ سکھوں کا متبرک مقام بھی ہے۔ 92 فی صد آبادی سکھوں کی تھی۔ ایک بہت بڑا گردوارہ بھی تھا۔ مکتسر سے دریائے ستلج 33 میل دور تھا۔ یہ مالوے کا علاقہ تھا اور یہاں کے سکھ ڈاکو بڑے مشہور تھے۔ یہ کروڈ قسم کے لوگ موسیقی والے سکھ تھے۔ یہ سارا خشک قسم کا علاقہ تھا۔ بارانی فصلیں ہوتی تھیں۔ نہ جانے کیسے آباد ہو گیا۔ آبادی والی کوئی بات نہیں تھی۔ جھنڈ' کریر' پھلاہی کے درخت عام تھے۔ کہیں کہیں ٹاہلیاں بھی تھیں۔ اس مکتسر کے قصبے میں ہجراہ داری پتی محلہ تھا۔ اس محلے میں ہمارا ایک حویلی نما مکان تھا۔ ایک منزلہ گھر کے پھاٹک کے سامنے گلی کراس کریں تو ایک واڑہ تھا جس میں گھوڑے بھینسیں وغیرہ بندھی ہوتی تھیں۔

میرے میٹرک کرنے کے بعد ہمارے قصبے میں بجلی آئی تھی۔ یعنی قیام پاکستان سے چار سال پہلے ـــــ بجلی گھر کے گرد باغ بنا ہوا تھا۔ یہاں ایک ٹینس کورٹ بھی تھا۔ تحصیل دار اور تھانیدار وغیرہ یہاں ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ کبھی کبھی انگریز ضلع افسر بھی آ جاتا تھا۔ ہم لڑکے ادھر جاتے گھبراتے تھے۔ یہاں دو تالاب بھی تھے۔ بہت بڑے تالاب۔ ان کا پانی صاف کر کے بڑی بڑی ٹینکیوں میں جاتا تھا۔ تالاب کے کنارے شریں' جامن اور ٹاہلیوں کے درخت تھے......"

اشفاق احمد میرے سامنے بیٹھا اپنے قصبے مکتسر کی گلیوں بازاروں' حویلیوں' تالابوں' ٹاہلیوں' پھلاہی کے درختوں اور کیکر کے زرد پھولوں کی باتیں کر رہا تھا اور میں اس کی دی ہوئی ڈائری پر شکستہ خط میں لکھتا جا رہا تھا۔ پھر میں نے لکھنا بند کر دیا۔ اب میں اشفاق کو دیکھ رہا تھا۔ اب اس نے ڈاڑھی رکھ لی ہے۔ میں نے اس کی ڈاڑھی میں کبھی دخل نہیں دیا۔ وہ چاہے جتنی مرضی ڈاڑھیاں رکھ لے۔ جتنی چاہے اپنے چہرے پر لکیریں ڈال لے۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں ہمیشہ 1948ء کے اشفاق احمد کو دیکھتا ہوں۔ مجھے اس کے بدلے ہوئے چہرے میں ہمیشہ 1948ء کے اشفاق احمد کا سرخ و سفید شگفتہ اور مردانہ وجاہت والا چہرہ نظر آتا ہے۔ میرے لئے اس کے چہرے میں ذرا سا بھی فرق نہیں پڑا۔

اتنا یاد ہے کہ وہ مجھے پہلی بار 1948ء میں لاہور میں ملا تھا۔ ظاہر ہے پاک ٹی ہاؤس میں یا اس کے آس پاس کہیں کافی ہاؤس کے قریب ہی ملا ہو گا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے مشہور امریکی ایکٹر کرک ڈگلس یاد آ گیا تھا۔ وہی چوڑا چکلا چہرہ مضبوط جبڑا' فراخ ماتھا' چوڑے کندھے' سرخ و سفید رنگ ـــــ اس کے چہرے پر ایک تاثر تھا۔ کچھ اس قسم کا تاثر' جیسے وہ کوئی شرارت کرنے

والا ہے یا کوئی شرارت کر کے آ رہا ہے۔ دوسری بات جو میں نے پہلی ملاقات میں نوٹ کی یہ تھی کہ وہ باتیں بہت کرتا ہے۔ دلچسپ باتیں کرتا ہے اور اس میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بڑی صلاحیت ہے۔ ہم تقریباً ہم عمر تھے۔ میں بھی نوجوان تھا۔ وہ بھی نوجوان تھا۔ ہمارے ایک ایک یا دو دو افسانے ادبی رسالوں میں چھپ چکے تھے اور ہم نے ادب میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ اپنے اس ادبی مقام کا مجھے بہت دیر بعد جا کر پتہ چلا۔ میں اپنی محبتوں کے جذب میں ڈوبا ہوا تھا اور اسی کیفیت میں افسانے پر افسانے لکھ رہا تھا۔ محبت میں جو میرے دل کی حالت ہوتی تھی میں افسانوں میں اسے بیان کر دیتا تھا۔ ان دنوں میرے پہلے افسانے "منزل منزل" کی ہیروئین راجدہ سے میرا بڑا دل گداز رومان چل رہا تھا۔ لاہور کی اس کشمیری نژاد لڑکی کا اصلی نام کچھ اور تھا۔ میں نے افسانے میں اس کا نام راجدہ لکھا تھا۔ ایک دن میں نے اشفاق احمد سے پوچھا کہ کیا وہ بھی کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے؟ وہ کچھ شرما سا گیا تھا۔ میں نے بھی مزید کچھ نہیں پوچھا تھا۔ ایک بات میں آپ کو شروع میں ہی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے مشاہدے اور تجربے کے مطابق اشفاق بنیادی طور پر شرمیلا آدمی ہے۔ اور مجھے اس کا یہ پہلو بھی اچھا لگتا ہے۔ شاید اس لئے کہ محبت میں میں اس کی ضد ہوں۔

میں اشفاق احمد سے 1948ء میں اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات مجھے بالکل یاد نہیں ہے۔ ماضی کے دھندلکوں پر نظر ڈالتا ہوں تو کچھ جھلکیاں سی ابھرتی ہیں۔ جیسے موسلا دھار بارش کے بعد بادلوں میں دور کبھی کبھی بجلی چمکتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ جب مشرقی پنجاب سے مہاجرین کے لٹے ہوئے قافلے پاکستان میں آ رہے تھے تو وہ والٹن کیمپ میں رجسٹر پر مہاجرین کے نام وغیرہ درج کیا کرتا تھا۔ پھر وہ ملتان چلا گیا اور وہاں

مہاجرین کیمپ میں کام کرتا رہا۔ مگر وہاں زیادہ دیر اس کا قیام نہ رہا اور وہ لاہور آ گیا۔ انہیں نمبر ایک مزنگ روڈ والا مکان الاٹ ہو چکا تھا۔ اس مکان کی تین چار منزلیں تھیں اور ایک زینہ ہر منزل سے ہوتا ہوا اوپر والی منزل تک جاتا تھا۔ اس اوپر والی منزل میں اشفاق احمد کا اپنا سٹوڈیو نما کمرہ تھا۔ ان دنوں وہ پینٹنگ بھی کرتا تھا۔ کمرے میں کتابیں' تصویروں کے فریم' رسالے ہر قسم کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک ایزل تھا جس پر ایک کینوس رکھا ہوا تھا۔ اس کینوس پر ایک آئل پینٹنگ بنی ہوئی تھی۔ یہ تجریدی آرٹ تھا جو مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ بعد میں یہی تصویر ممتاز مفتی کی کتاب "اسمارائیں" کے ٹائیٹل پر نظر آئی۔ یعنی "اسمارائیں" کتاب کا سرورق اشفاق احمد نے بنایا تھا۔ جب اشفاق مجھے اپنی بنائی ہوئی پینٹنگ دکھا رہا تھا تو مجھے یاد ہے کمرے میں بڑا حبس اور گرمی تھی۔ مجھے یہ گرمی اور حبس آج تک یاد ہے۔ ماضی کے دھندلکوں میں ایک روشنی سی چمکتی ہے اور میں اور اشفاق چوہٹہ مفتی باقر کے ایک تنگ بازار میں جا رہے ہیں۔ اشفاق چہرے پر لگانے والی کریم کی خالی شیشیاں خریدنے یہاں آیا ہے۔ میں اس کے ساتھ ہوں۔ ہم دکان دکان پھر کر شیشیاں دیکھ رہے ہیں۔ اشفاق احمد اندرون لاہور کے کلچر پر تبصرہ بھی کر رہا ہے۔ یہاں سے ہم شاہ عالمی کی لال مسجد کے پاس نکل آئے ہیں۔ سارا شاہ عالمی ٹوٹا ہوا اور جلا ہوا ہے۔ صرف لال مسجد سلامت ہے۔ جگہ جگہ مکانوں کے ملبے کے اونچے اونچے ڈھیر لگے ہیں۔ بانسوں والے بازار سے لے کر رنگ محل تک ملبہ ہی ملبہ ہے۔ ملبے کے ٹیلے بنے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے چلنے سے ان ٹیلوں پر پگ ڈنڈیاں بن گئی ہیں۔ ہم دونوں ملبے کی ایک پگ ڈنڈی پر چلتے ہوئے واپس جا رہے ہیں۔ رنگ محل اور لوہاری منڈی کی طرف مکان سلامت ہیں۔ باقی سارے کا سارا رڑا میدان ہے۔ کہیں کہیں کسی مکان کی

اونچی اونچی دیواریں ابھی تک کھڑی ہیں۔ چھتیں ڈھے چکی ہیں۔ دیواریں ایک طرف کو جھکی ہوئی ہیں۔ ہم فسادات پر باتیں کرتے جا رہے ہیں اشفاق کہہ رہا ہے۔

"بڑی زبردست آگ لگی ہے یہاں"

میں اسے بتا رہا ہوں کہ ہندوؤں نے یہاں بے پناہ اسلحہ اور گولہ بارود جمع کر رکھا تھا۔ اس گولہ بارود کے پھٹنے سے یہاں زیادہ تباہی نازل ہوئی ہے۔ ہم شاہ عالمی دروازے میں آ گئے ہیں۔ یہاں کوئی دروازہ نہیں ہے۔ چوک میں کسی نے ٹائر جلا کر رکھ دیا تھا جس میں سے گہرا کالا سیاہ دھواں اٹھ رہا ہے۔ ہم بانس والے بازار میں سے گزر رہے ہیں۔ یہاں کسی دکان کو آگ نہیں لگی۔ شروع میں دونوں جانب تنک، کھجوری پنکھوں، داتن اور باروانے کی دکانیں ہیں۔ ایک آدمی بوریاں جھاڑ جھاڑ کر ایک طرف لگا رہا ہے۔ گرد اڑ رہا ہے۔ میں گرد سے بچنے کے لئے تیز تیز چلنے لگتا ہوں۔ آگے کھلی دکانوں کے چھوٹے چھوٹے واڑے ہیں جہاں اونچے اونچے خوبصورت بانسوں کی بھریاں دیواروں کے ساتھ لگی ہیں۔ میں ان بانسوں کو دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں۔ مجھے برما، لنکا اور بنگال کے جنگل یاد آ رہے ہیں۔ ان جنگلوں کی تیز بارشوں میں بھیگتے ہرے بھرے بانسوں کے جھنڈ یاد آ رہے ہیں۔

بانسوں والے بازار میں کوئی رش نہیں ہے۔ کوئی سکوٹر کوئی رکشا نہیں ہے۔ کسی وقت کوئی تانگہ گزر جاتا ہے۔ دائیں جانب ایک راستہ اندر سرائے کے کشادہ میدان کی طرف جاتا ہے۔ سرائے میں بسوں کا اڈہ ہے۔ یہاں سے بسیں دوسرے شہروں کو جاتی ہیں۔ اس طرف سے کبھی کبھی کسی لاری کی گڑ گڑ کی آواز سنائی دے جاتی ہے۔ ہم میو ہسپتال کے گیٹ میں داخل ہو گئے ہیں۔ ہماری منزل پاک ٹی ہاؤس ہے۔ مجھے میو ہسپتال سے پاک ٹی ہاؤس کی طرف جانے والا راستہ بہت

پسند ہے۔ میو ہسپتال خاموش خاموش ہے۔ ہم بائیں جانب پکی اینٹوں والے فٹ پاتھ پر چل رہے ہیں۔ یہاں ڈاکٹروں کی دو منزلہ رہائش گاہیں ہیں۔ پرانے فیشن کی ٹھنڈے برآمدوں اور آگے کو نکلی ہوئی گیلریوں والی عمارتیں ہیں ان گیلریوں پر کہیں کہیں بوگن ویلیا کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ دو رویہ پیپل کے درخت دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ سامنے نرسوں کے کوارٹر ہیں۔ ایک سفید پوش نرس کوارٹر کے باغیچے میں سے نکل کر ہسپتال کی لابی کی طرف جا رہی ہے۔ ہسپتال کے باغیچوں میں بڑا سبزہ ہے۔ کیاریوں میں پھول مسکرا رہے ہیں۔ ہوا چلتی ہے تو پیپل کے پتے ادھر ادھر ہلتے ہوئے دھوپ میں ستاروں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ ہسپتال کی چھتی ہوئی ڈیوڑھی کے سامنے ہرے بھرے پلاٹ کے آگے بڑ کا ایک بہت عظیم الشان درخت ہے جس کے نیچے چائے کی کینٹین ہے۔ دو چار سٹوڈنٹ سفید کوٹ پہنے گھاس پر بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ ہم سیڑھیاں اتر کر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج والی روش پر آ جاتے ہیں جس کی دونوں جانب سرو کے درخت کھڑے ہیں۔ ایک جانب کسی بزرگ کا مزار ہے۔ مزار کے قریب سے گزرتے ہیں تو اگربتیوں کی خوشبو آتی ہے۔ اشفاق کہہ رہا ہے۔

"ہمارے قصبے کے باہر بھی کسی بزرگ کا ایک مزار تھا۔ جمعرات کو وہاں بڑی رونق ہوتی تھی۔ مٹی کے چراغ روشن ہوتے۔ چاروں طرف اگربتیوں کی خوشبوئیں پھیل جاتیں۔"

میڈیکل کالج کے نیلا گنبد والے گیٹ کے پہلو میں ایک پلاٹ ہوتا تھا جہاں سارے کے سارے گلاب لگے تھے۔ یہ ولایتی گلاب تھے۔ ان کی بڑی دیکھ بھال کی جاتی تھی موسم بہار میں رنگ برنگ کے گلاب کھلتے۔ یہاں زرد گلاب بھی تھے۔ اسی باغیچے میں میں نے پہلی بار وہ زرد گلاب دیکھا تھا جس کو دیکھ کر میرے ذہن میں رضیہ کی شکل ابھری تھی

جس پر میں نے اپنا ناولٹ "زرد گلاب" لکھا تھا میں اور اشفاق احمد باغیچے میں آکر دیر تک ولایتی گلابوں کو دیکھتے رہے۔ یہاں سے ہم پاک ٹی ہاؤس آ گئے۔

پاک ٹی ہاؤس ان دنوں ادیبوں شاعروں کا ٹی ہاؤس تھا۔ ہم لوگ صبح سے لے کر رات گئے تک یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ ہماری محفلیں لگتی تھیں۔ ٹی ہاؤس میں ہمارے دوست موجود تھے۔ میں اور اشفاق دیوار کے ساتھ دو آدمیوں والے ٹیبل پر آکر بیٹھ گئے۔ اشفاق احمد نے سفید قمیض اور ہلکے نسواری رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ یہ بہار کا موسم تھا۔ ٹی ہاؤس کے پنکھے چل رہے تھے۔ فضا میں چائے' سگار اور سگرٹوں کی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ دیوار کے شیشے میں سے گلابی روشنی ٹی ہاؤس میں آ رہی تھی۔ اشفاق مجھ سے امرتسر کی اور میں اس کے قصبے اور شہر کی باتیں پوچھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ساتویں جماعت میں تھا کہ کرکٹ کی ایک ٹیم کے ساتھ امرتسر سے فیروزپور شہر گیا تھا۔ مجھے فیروزپور شہر بڑا صاف ستھرا اور خاموش خاموش شہر لگا تھا۔

"ہماری ٹیم کو ایک اسکول میں ٹھہرایا گیا تھا مجھے یاد ہے چائے کے ساتھ ہمیں سیب دیئے گئے۔ سیب لال لال اور چھوٹے چھوٹے تھے۔"

میں نے ڈبی میں سے کیپٹن کا سگریٹ نکال کر سلگایا۔ ایک سگریٹ اشفاق کو بھی دیا۔ اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ وہ سگریٹ کا عادی نہیں تھا۔ محض فیشن کے طور پر کبھی کبھی سگریٹ سلگا لیتا اور دھواں بہت کم حلق سے نیچے اتارتا۔ میں نے اسے کہا۔

"اگر تم دھواں حلق سے نیچے نہیں لے جاتے تو پھر میرا سگریٹ ضائع نہ کرو"

وہ ہنسنے لگا۔

"یار یہ شرط نہ لگاؤ۔ میں کبھی کبھی گہرا کش بھی لگا لیتا ہوں"

بیرا لال چائے لے آیا۔ میں نے چائے بنائی۔ ہم چائے پیتے اور باتیں کرنے لگے۔ اشفاق احمد کا سر بڑا شاندار اور بھاری بھرکم تھا۔ اس کے بھورے بھورے بال ماتھے پر لہریں بناتے ہوئے اوپر کو اٹھتے تھے اور بڑے گنجان تھے۔ ہم دونوں کی بھرپور نوجوانی کی عمر تھی۔ جو کرتے وہ اچھا لگتا۔ بری سے بری چائے بھی اچھی لگتی تھی۔ نوجوان خون کی گرمی میں گرم تھے۔ چہروں پر چمک تھی۔ بالوں میں چمک تھی۔ باتوں میں چمک تھی۔ ایک روشنی سی تھی جس کو ہم ساتھ لے کر چلتے تھے۔ جو ہمارے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔

اشفاق چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

"یار! میں گھر جا رہا ہوں۔ شام کو ٹی ہاؤس آؤں گا۔ تم یہاں ہو گے؟"

وہ چلا گیا۔

یہاں ایک بار پھر ماضی کے آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں۔ پرانی یادوں کے سٹیج کا پردہ ایک بار پھر گرتا ہے۔ بادلوں میں دھیمی دھیمی بجلی چمکتی ہے۔ پردہ ایک بار پھر اٹھتا ہے۔ اس بار منظر گورنمنٹ کالج لاہور ــــ نہیں نہیں ــــ پنجاب یونیورسٹی کے پائیں باغ کا ہے۔ میں چھوٹے سے پائیں باغ کی روش پر سے ہوتا ہوا اشفاق احمد کی طرف بڑھتا ہوں۔ وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر میری طرف بڑھ رہا ہے۔ کتاب اس کے ہاتھ میں ہے۔ سنہری دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ ہم دونوں مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اشفاق احمد کا سرخ و سپید چہرہ روغنی لگ رہا ہے۔ وہ مسکرا رہا ہے۔ اس کے دانت چھوٹے چھوٹے مگر ہموار اور سفید تھے۔ میں نے اشفاق کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

"آؤ ٹولنٹن مارکیٹ چلتے ہیں مجھے پائپ کے لئے تمباکو خریدنا ہے"

میں کبھی اکیلا اور کبھی کسی دوست کے ساتھ کسی نہ کسی بہانے ٹولنٹن مارکیٹ کا ایک چکر ضرور لگاتا تھا۔ اس کی وجہ ٹولنٹن مارکیٹ کی وہ مخلوط ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبو تھی جو وہاں فضا میں ہر طرف بسی ہوئی ہوتی تھی۔ میں جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں سے نیا نیا جدا ہوا تھا۔ ان ملکوں کی بارشوں کی آواز اور استوائی پھولوں کی گرم خوشبوئیں میرے ساتھ سانس لیتی تھیں۔ جب میں ٹولنٹن مارکیٹ میں داخل ہوتا تو مجھے ایسے لگتا کہ جیسے میں رنگون کی اسکاٹ مارکیٹ اور کولمبو کے ساحل سمندر پر بارش میں بھیگتے ناریل کے درختوں میں آگیا ہوں۔

اشفاق احمد نے سبزیوں کے سٹال پر سے ایک بڑا سا ٹماٹر اٹھایا۔ اسے انگلیوں میں گھماتے ہوئے غور سے دیکھ کر بولا۔

"حمید! ایسے ٹماٹر فیروز پور چھاؤنی کی دکانوں پر بہت ہوتے تھے۔ یہ ولایتی ٹماٹروں کی نسل میں سے ہیں۔ ہمارے اکثر میں دیسی ٹماٹر ہوتے تھے جو بڑے رس بھرے نازک اور سبز اور سرخ اور زرد رنگ کے ہوتے تھے۔"

مارکیٹ کی ایک دکان سے ہم نے آرن مور کے تمباکو کا گول ڈبہ خریدا اور ہم اشفاق کے مزنگ روڈ والے مکان کے اوپر والے کمرے میں آگئے۔ اشفاق احمد ایزل کے پاس برش لے کر کھڑا ہو گیا اور کینوس پر بنی ہوئی غیر مکمل آئل پینٹنگ کو غور سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ برش کو کینوس کے ساتھ لگا کر پیچھے ہٹ جاتا اور گردن ایک طرف جھکا کر غور سے کینوس کو دیکھنے لگتا۔ یہ بھی ایک تجریدی تصویر تھی۔ میلے کچیلے رنگ لگے تھے جو مجھے بڑے گندے لگ رہے تھے۔ میں نے کچھ اس قسم کا تبصرہ کیا تو اشفاق برش ایک طرف رکھ کر گندے

کپڑے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔

"یہ ایبسٹریکٹ آرٹ ہے حمید۔ تم سیدھے سادے رومانوی رائٹر ہو۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔"

مگر میرا خیال تھا کہ اشفاق احمد بھی اسے نہیں سمجھ رہا۔ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا بنا رہا ہے۔

اس زمانے کے اشفاق احمد کی ایک اور تصویر اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ بادامی رنگ کا گول گلے والا کرتا اور رنگین لاچا پہنے پاک ٹی ہاؤس میں دروازے کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھا ہے۔ میں اس کے سامنے بیٹھا ہوں۔ قیوم نظر، شہرت بخاری اور دوسرے دوست بھی موجود ہیں۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ بڑی گرم جوشی کے ساتھ باتیں ہو رہی ہیں۔ اس روز اشفاق لاچہ اور کرتا پہن کر پاک ٹی ہاؤس آگیا تھا اور ماجھے کا خوبرو جٹ لگ رہا تھا۔ مجھے ان کا اس طرح کے لباس میں وہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے اس لباس کے بارے میں اپنے ردعمل کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی مرضی ہے۔ جو چاہے پہن کر آجائے۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بعد اشفاق احمد کو میں نے ماجھے کے جٹ کے بہروپ میں پاک ٹی ہاؤس میں پھر کبھی نہیں دیکھا۔

اشفاق احمد کے ساتھ جو میں نے ایک طویل عرصہ گذارا ہے اس کی یادیں دھندلی نہیں پڑیں۔ ہاں کہیں کہیں سے سلسلہ ضرور ٹوٹ گیا ہے اور ایسا ہونا قدرتی بات ہے لیکن جہاں جہاں وہ مجھے یاد ہے اس یاد کی پوری جزئیات میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ یہ ایک طرح نیگیٹو ہیں میری یادوں کے جن کی تصویریں بنا کر میں اس کتاب میں چھاپاں کرتا جا رہا ہوں۔ جس طرح آج کل وقت گزر رہا ہے اسی طرح اس زمانے میں بھی وقت گزر رہا تھا۔ مگر ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ہمارے لئے وقت

ایک مقام پر آ کر رک گیا ہوا تھا۔ یہ مقام نوجوانی کے عروج کا مقام تھا۔ چہرے روشن تھے۔ ناخنوں پر چاند چمکتے تھے۔ کوئی چہرہ بدصورت نہیں تھا۔ کوئی آواز بے سری نہیں تھی۔ گرمیوں میں اگر درختوں کی چھاؤں میں سکون ملتا تھا تو چلتی ہوئی گرم لو بھی اچھی لگتی تھی۔ مال روڈ اتوار کو خالی خالی ہوتی تھی۔ اشفاق کے گھر کے آگے جو مزنگ روڈ صفاوالا چوک کی طرف جاتی تھی اس پر کبھی کبھار ہی کوئی تانگہ گزرتا تھا۔ نہ کوئی رکشا تھا' نہ ویگن' نہ کوئی بس' اس زمانے کی مزنگ روڈ کی ایک فوٹو اتفاق سے میرے پاس محفوظ رہ گئی ہے۔ اس تصویر میں میرے ساتھ ہمارا مصور دوست انور جلال شمزہ بھی ہے۔ یہ فوٹو ایک فوٹوگرافر نے ہمارے پیچھے سے اتاری تھی۔ ہم لوگ اس روز اشفاق سے ملنے گئے تھے۔ کچھ دیر اس کے چوتھی منزل والے کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ قہقہے لگاتے رہے۔ انور جلال شمزہ نے اشفاق کی پینٹنگز دیکھیں۔ تجریدی آرٹ پر کچھ بحث ہوئی۔ پھر ہم واپس چل پڑے۔ ہمارے ساتھ ہمارا ایک فوٹوگرافر دوست بھی تھا۔ اس نے بجائے اس کے کہ سامنے سے آ کر ہماری تصویر بناتا ہمارے پیچھے چلا گیا اور ہم بازار میں چلے جا رہے تھے کہ اس نے تصویر اتار لی۔ آج میں اس تصویر کو کبھی کبھی صرف مزنگ روڈ کو دیکھنے کے لئے دیکھتا ہوں۔ خالی خالی مزنگ روڈ مجھے کسی اجنبی شہر کی سڑک لگتی ہے۔ تصویر میں صرف ایک تانگہ نظر آ رہا ہے۔ باقی ساری سڑک خالی پڑی ہے۔

ہماری محفلیں زیادہ تر پاک ٹی ہاؤس میں لگتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی ہم کافی ہاؤس میں بھی چلے جاتے تھے۔ میں اس لئے کافی ہاؤس جاتا کہ وہاں فضا میں رچی ہوئی کافی کی خوشبو مجھے جنوب مشرقی ایشیا کی فضاؤں میں لے جاتی تھی۔ خاص طور پر مجھے رنگون' کولمبو اور مدراس کے ریستوران یاد آ جاتے جہاں اپنی آوارہ گردی کے دوران میں بیٹھ کر

میں کافی پیا کرتا تھا۔ لاہور کے کافی ہاؤس میں زیادہ تر صحافی' وکلا اور سیاست دان ہی بیٹھتے تھے۔ شاعروں میں ریاض قادر اور ناصر کاظمی وہاں اکثر دیکھے جاتے تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت' ریاض قادر' سردار صادق اور بٹ کافی ہاؤس کی محفلوں میں سب سے نمایاں نظر آتے تھے۔ یہ لوگ جس میز پر بیٹھے ہوتے وہاں دوسرے لوگ بھی کرسیاں کھینچ کر آ بیٹھتے اور ان لوگوں کی سیاسی' ادبی اور دلچسپ باتیں بڑی دلچسپی سے سنتے اور ان کی لطیفہ بازیوں سے لطف اندوز ہوتے۔ میں اور اشفاق احمد دیوار کے ساتھ والی مخمل پر جا کر بیٹھ جاتے۔ ہاتھ ملا کر لوگوں سے علیک سلیک کرتے اور کافی پیتے ہوئے اپنی باتیں کرنے لگتے۔ سبھی ادیب اور شاعر ہمارے دوست تھے۔ ہم سب سے ملتے تھے۔ سب ہم سے ملتے تھے۔ مگر ہم دونوں ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے تھے۔ ہماری بڑی پکی دوستی ہو گئی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے اشفاق بڑا اچھا لگتا۔ اس کی باتیں بڑی اچھی لگتیں۔ وہ پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہوتا تو میں ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا لیتا۔ اور ہم خوب کھل مل کر مزے مزے کی باتیں کرتے۔ اسی زمانے میں اشفاق احمد نے اپنا مشہور افسانہ بلکہ طویل مختصر افسانہ "گڈریا" لکھا جس کی چاروں طرف دھوم مچ گئی۔ میں نے افسانہ پڑھا تو مجھے اشفاق سے اور زیادہ محبت ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب نامور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو بمبئی سے لاہور واپس آ چکے تھے اور مسعود پرویز کے ساتھ مل کر ایک پنجابی فلم بنا رہے تھے۔ انہوں نے بھی اشفاق احمد کا افسانہ "گڈریا" پڑھ لیا تھا اور اس سے بڑے متاثر تھے۔ منٹو صاحب لکشمی مینشنز کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ ایک بار میں اور اشفاق احمد ان سے ملنے گئے تو منٹو صاحب نے اشفاق کے افسانے کی تعریف کی۔ اشفاق جھینپ گیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور بولا۔

"وہ تو منٹو صاحب بس ----"

منٹو صاحب نے عقابی آنکھوں سے اشفاق کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بس کیا۔ اچھا افسانہ لکھا ہے تم نے ----"

پھر منٹو صاحب نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"تم بکواسی ہو۔ مجھے کو دیکھ کر رومانٹک ہو جاتے ہو"

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ منٹو صاحب اشفاق احمد کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس سے میرے دل میں رشک یا حسد کا جذبہ بالکل پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ اشفاق احمد سے میری محبت کا کمال تھا کہ جو اس سے پیار کرتا تھا مجھے اس سے بھی پیار ہو جاتا تھا۔ میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ خدا نے میرے دل کے سیپ میں محبت کا موتی رکھ دیا ہے۔ کوئی کسی سے محبت کرتا ہے تو میرے دل کا سیپ اپنے آپ کھل جاتا ہے اور اس کے موتی کی روشنی میرے جسم کے اندر اور باہر چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔

ماہنامہ "نقوش" کا اجرا ہو چکا تھا۔ یہ اجرا کا لفظ بڑا مشکل لفظ ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رسالہ "نقوش" نکلنے لگا تھا۔ اس رسالے کی اپنی ایک الگ شان تھی۔ طفیل صاحب نے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لا کر اس ادبی رسالے کو بڑا معیاری اور مستند بنا دیا تھا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب' خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور اس کے عملہ ادارت کے روشن ستارے تھے۔ "نقوش" کا ناولٹ نمبر نکلا تو اس میں میرا ناولٹ "جہاں برف گرتی ہے" اور اشفاق کا ناولٹ "مہمان بہار" چھپا۔ اشفاق احمد کا یہ ناولٹ بھی بہت مشہور ہوا۔ اس وقت اشفاق اپنے فن کے عروج پر تھا۔ اس کا مشاہدہ اور جزئیات نگاری حیرت انگیز تھی۔ اب میں اور اشفاق "نقوش" کے دفتر بھی جاتے "نقوش" کا دکان نما دفتر ان دونوں ایک روڈ پر ہوتا تھا۔ شیشے کی الماریوں کے

ساتھ آمنے سامنے کرسیاں لگی ہوتیں۔ دیوار کے ساتھ ایک میز تھا جہاں نقوش کے چیف ایڈیٹر اور مالک محمد طفیل بیٹھتے تھے۔ طفیل صاحب کو قدرت نے ادب شناسی کے جوہر کے ساتھ ساتھ بڑی ہر دلعزیز قسم کی شخصیت بھی عطا کی تھی۔ وہ مختصر مگر بڑی معقول اور ٹو دی پوائنٹ بات کرتے۔ یہاں وقار عظیم صاحب' عبادت بریلوی اور احمد ندیم قاسمی صاحب سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہو جاتا جو میری اور اشفاق احمد کی بڑی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں رسالہ "سویرا" کی جانب سے اس کے مالک اور مدیر نذیر چودھری صاحب نے لارنس باغ میں ادیبوں کو چائے کی دعوت دی۔ "سویرا" پر ترقی پسند ادب کا لیبل لگا ہوا تھا۔ مگر اس دعوت میں ان ادیبوں اور شاعروں نے بھی شرکت کی جن کا ترقی پسند تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس ٹی پارٹی کی دو تین تصویریں میرے پاس آج بھی محفوظ ہیں ان ادیبوں میں سے بعض ہمارے دوست اور بزرگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور جو زندہ ہیں وہ ان تصویروں میں پہچانے نہیں جاتے۔ ادارہ "نقوش" کی جانب سے لارنس میں جو پارٹی دی گئی اس میں منٹو صاحب' وقار عظیم' عبادت بریلوی' احمد ندیم قاسمی' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور' ظہیر بابر' شوکت تھانوی اور دوسرے کئی مشہور ادیب اور شاعر شریک ہوئے۔ اس پارٹی کی مختلف تصویریں "نقوش" رسالے میں چھپی تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر کافی مدت تک میرے پاس محفوظ رہی۔ اس تصویر میں سعادت حسن منٹو کے ساتھ میں اور اشفاق احمد کھڑے ہیں۔ یہ تصویر فوٹو گرافر نے لارنس باغ کے اوپن ایئر کیفے کے اس درخت کے نیچے اتاری تھی جس کی ایک لمبی شاخ ہمارے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے پائپ اپنی پتلون کی بیلٹ میں لگایا ہوا ہے۔ میں ان دنوں پائپ پیا کرتا تھا۔ پاکستان آ کر ہمارا ادبی سفر شروع ہو چکا تھا۔ میں اور اشفاق احمد دونوں برابر

افسانے لکھ رہے تھے۔ میں ناول اور ناولٹ بھی لکھ رہا تھا۔ اشفاق کے افسانوں کا مجموعہ "اجلے پھول" چھپ گیا تھا۔ یہ کتاب بک لینڈ پبلشرز کی طرف سے شائع کی گئی تھی۔ یہ اشاعتی ادارہ وائی ایم سی اے ہال کی بلڈنگ میں مال روڈ کی جانب ایک لمبی دکان میں تھا۔ میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ "منزل منزل" اور پہلا ناول "ڈربے" شائع ہو گیا تھا۔

وائی ایم سی اے ہال کی دوسری منزل والے کمرے میں حلقہ ارباب ذوق کے ہفتہ وار ادبی اجلاس ہوتے۔ میں اور اشفاق بھی ان جلسوں میں شرکت کرتے۔ کبھی ترقی پسند مصنفین کے ادبی اجلاس میں شریک ہوتے۔ اشفاق احمد نے بانو قدسیہ سے شادی کر لی تھی اور وہ سمن آباد کے ایک مکان میں رہنے لگا تھا۔ اب وہ نمبر ایک مزنگ روڈ والے مکان سے چلا گیا تھا۔ اس کا سمن آباد والا پہلا مکان چھوٹی مارکیٹ میں سنٹرل ماڈل سکول کے سامنے تھا۔ اس مکان پر بڑے شیشے لگے تھے اور اسے شیشوں والا کوارٹر کہتے تھے۔ یہاں اشفاق نے تھوڑا عرصہ ہی قیام کیا اور دوسرے مکان میں چلا گیا۔ دوسرا مکان بھی سمن آباد میں گراؤنڈ کے سامنے تھا۔ اب یہ گراؤنڈ ایک باقاعدہ باغ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اسی زمانے میں ابھی یہاں مٹی اڑتی تھی۔ اشفاق کے گھر کے بالکل سامنے گراؤنڈ میں کھجور کے تین درخت ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ میں انہیں تین بہنیں کہا کرتا تھا۔ میں اکثر اشفاق سے ملنے یہاں آتا تھا۔ ایک بار میں نئے مزنگ میں اپنے ایک واقف کار سے ملنے گیا۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ گرمیوں کی دوپہر تھی۔ بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ لو بھی چل رہی تھی۔ مگر مجھے یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ میں تانگے میں نئے مزنگ تک آیا تھا۔ جب مجھے میرا واقف کار نہ ملا تو میں پیدل ہی سمن آباد کی طرف چل پڑا۔ آج کل اس سڑک پر پیدل چلنا محال ہے۔ آدمی رکشاؤں اور گاڑیوں کے درمیان پھنس جاتا ہے۔ مگر

پاکستان کا شروع شروع کا زمانہ تھا۔ سمن آباد کے این ٹائپ کوارٹروں کی قطاریں ہی ابھی تعمیر ہوئی تھیں۔ نئے مزنگ سے سمن آباد کی طرف جاتی سڑک خالی خالی تھی۔ ایک طرف قبرستان تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے بوسکی کی قمیض کے ساتھ گرے ورسٹڈ کی پتلون اور سرشوز پہن رکھے تھے۔ میں پیدل چلتا سخت گرمی میں اشفاق احمد کے گھر پہنچ گیا۔ یہ این ٹائپ کا مکان تھا۔ میں چھوٹی سی گلی میں سے گزر کر مکان کے عقبی صحن میں گیا۔ بانو قدسیہ باورچی خانے میں چوکی پر بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھیں۔ میں اور اشفاق احمد دیوان خانے میں آ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں بانو قدسیہ میرے لئے آئس کریم لے آئی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ اس وقت مجھے آئس کریم کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں سہ پہر تک اشفاق کے ساتھ رہا۔ ہم دونوں مکان کے برآمدے میں بیٹھے خدا جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ اب وہ باتیں مجھے یاد نہیں ہیں۔ ہمارے سامنے سڑک پر ٹاہلی کے درخت گرمیوں کی گرم سہ پہر میں سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔

اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ شادی کے بعد مجھے بھی اسی علاقے میں آ کر آباد ہونا ہے۔ آج کل میں سمن آباد میں ہی اپنے مکان میں رہ رہا ہوں۔ میرا یہ مکان اشفاق احمد کے سمن آباد والے مکان سے قریب ہی ہے۔ صبح سیر کرنے جاتا ہوں تو روزانہ اشفاق کے مکان کے سامنے سے گزرتا ہوں اور مجھے وہ زمانہ یاد آ جاتا ہے۔ اب یہ گراؤنڈ بڑے اچھے باغ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ساتھ ساتھ اُگے ہوئے کھجور کے تینوں درخت غائب ہو چکے ہیں۔ وہ درخت وہ تین بہنیں مجھے بڑی یاد آتی ہیں۔ ان کی جگہ باغ میں نئے نئے درخت لگ گئے ہیں۔ تقریباً یہ سارے درخت میرے سامنے لگے تھے اور میرے سامنے جوان ہوئے ہیں۔ اب سب سے میری دوستی ہے۔ ان درختوں میں سنبل اور

یوکلپٹس کے درخت زیادہ ہیں۔ سنبل کے ایک درخت سے میری اس کے
بچپن کے زمانے سے دوستی ہے۔ اب یہ درخت جوان ہو چکا ہے۔ منہ
اندھیرے جب میں ستاروں کی دھندلی روشنی میں اس درخت کے پاس آتا
ہوں تو وہ بڑا خوش ہوتا ہے۔ ہم خاموش زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ ایک
دوسرے کا حال پوچھتے ہیں اور میں سیر کرتے ہوئے آگے نکل جاتا ہوں۔

اب اشفاق احمد نے ایک سائیکل خرید لی تھی۔ وہ سائیکل پر سمن آباد
سے پاک ٹی ہاؤس اور ریڈیو سٹیشن آتا۔ ہم دونوں ریڈیو پاکستان لاہور کے
ساتھ بطور سٹاف آرٹسٹ منسلک ہو چکے تھے۔ میرا مکان ان دنوں فلیمنگ روڈ
پر تھا۔ میں لاہور ہوٹل والی سڑک پر سے ہوتا ہوا قلعہ گجر سنگھ سے نکل کر
ایبٹ روڈ پر آتا تو یہاں کبھی کبھی اشفاق سے ملاقات ہو جاتی وہ سائیکل پر سوار
ریڈیو سٹیشن کی طرف جا رہا ہوتا۔ اگر وہ مجھ سے تھوڑا آگے نکل گیا ہوتا تو
میں اسے آواز دے کر روک لیتا۔ کبھی وہ مجھے جاتا دیکھ کر میرے پاس آ کر
سائیکل سے اتر جاتا اور ہم دونوں باتیں کرتے شملہ پہاڑی کی طرف چل
پڑتے۔ جہاں اب لاہور ٹیلی ویژن سنٹر کی عمارت کھڑی ہے۔ یہاں ان دنوں
ایک ویران سے احاطے میں ایک چھوٹی سی کاٹج نما پرانی کوٹھی ہوا کرتی تھی۔
چاروں طرف تاروں کی باڑھ لگی تھی۔ سڑک کی جانب اندر جاتے کچے راستے
پر ایک تختی لگی تھی جہاں کسی میجر صاحب کا نام لکھا تھا۔ میں وہ نام بھول گیا
ہوں۔ یہاں کبھی کبھی ایک دو فوجی نئے بھرتی ہونے والے جوانوں کی چھاتی اور
قد کا ناپ لیتے بھی نظر آ جاتے تھے۔ اس احاطے کے ایک کونے میں املتاس کا
ایک درخت ہوا کرتا تھا۔ گرمیوں میں ان درختوں پر زرد پھول آتے۔ ان
پھولوں کے زرد فانوس دیکھنے کے لئے میں اور اشفاق تھوڑی دیر کے لئے رک
جاتے تھے۔ پرانا ریڈیو سٹیشن شملہ پہاڑی کے پیچھے پرانے زمانے کی ایک نیم
شکستہ کوٹھی میں تھا۔ اس کے گیراج میں ریڈیو کی کینٹین تھی۔ علم و ادب اور
دنیائے موسیقی کی بڑی بڑی اہم شخصیتیں اس ٹوٹی ہوئی کرسیوں والی کینٹین

میں بیٹھ کر چائے پیا کرتی تھیں۔

اسی ایبٹ روڈ پر ایک بار میں اکیلا ٹاہلیوں کے درختوں کے نیچے سے ہوتا ریڈیو سٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ پیچھے سے آ کر اشفاق سائیکل سے اتر گیا اور ہم باتیں کرتے چلنے لگے۔ اس نے کہا۔

"میں ریڈیو سے ایک سلسلہ وار فیچر شروع کرنے والا ہوں جو ایک ایسے بزرگ کے بارے میں ہو گا جو دوسروں کو بڑی نصیحتیں کرتا ہے مگر خود ان پر کبھی عمل نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا عمل ان نصیحتوں کے بالکل الٹ ہوتا ہے۔ میں نے اس کا نام "تلقین شاہ" سوچا ہے۔ کیا خیال ہے؟"

میں نے اسے جواب دیا تھا۔

"یہ کام تم بہت اچھا کر لو گے کیونکہ تم بھی دوسروں کو بڑی ہدایتیں دیتے رہتے ہو"

یا تو اشفاق احمد کا مزاج ہی ایسا ہے اور یا پھر وہ واقعی دوسروں کا بھلا چاہتا ہے۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ وہ دوسروں کو نیکی کی بڑی تلقین کرتا ہے۔ بڑی کارآمد ہدایتیں دیتا ہے۔ بھرپور جوانی کے دنوں میں بھی میں نے اس کی زبان سے کوئی گالی یا گناہ کی بات شاید ہی کبھی سنی ہو۔ یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ باتیں کرنے میں وہ بڑا ماہر ہے۔ قدرت یہ عطیہ کسی کسی کو عطا کرتی ہے۔ اس زمانے میں بھی اسکا حلقہ اثر وسیع ہو گیا تھا اور دو ایک آدمی ہر وقت اس کی خدمت کے لئے تیار رہتے تھے۔ سماجی حیثیت سے اشفاق احمد کا کردار شروع ہی سے بے داغ رہا ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس نے نہ تو کبھی کسی کو قرض دیا ہے اور نہ کسی سے قرض لیا ہے۔ منٹو کی طرح اس نے شرابیں بھی نہیں پی۔ میری طرح اس نے عشق معاشقے بھی نہیں کئے۔ ایسا آدمی ہمارے روایت پرست معاشرے میں اپنا حلقہ اثر پیدا کرنے میں بڑی آسانی سے کامیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اشفاق بھی اس معاملے

میں بڑا کامیاب تھا اور ہے۔ شراب نہ پینے اور عورتوں سے عشق نہ کرنے کو میں کوئی خوبی نہیں سمجھتا۔ اگر آپ اسے خوبی سمجھتے ہیں میری رائے میں اشفاق میں یہ خوبیاں اس لئے پائی جاتی ہیں کہ وہ طبعاً" کمزور آدمی ہے۔ اس کے جذبے بھی کمزور ہیں اور اس کا معدہ بھی شروع سے کمزور رہا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ میں خوب شراب پیا کرتا تھا۔ ایک روز ہم شملہ پہاڑی کی طرف سے اسمبلی ہال کی طرف آ رہے تھے۔ اشفاق نے نئی نئی گاڑی خریدی تھی۔ ابھی شراب پر پابندی نہیں لگی تھی اور مال روڈ پر انگلش وائین کی دکان ہوا کرتی تھی۔ اشفاق گاڑی سیدھی پلازا سینما کی طرف نکالنے لگا تو میں نے اسے کہا۔

یہاں سے دائیں جانب گاڑی موڑ لو اور انگلش وائین سے مجھے جم خانے کا کوارٹر لے کر دو"

اشفاق نے گاڑی دائیں جانب مال پر کر لی اور کہنے لگا۔

"میں گاڑی میں ہی بیٹھوں گا۔ تم جا کر لے آنا"

وہ گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

"تمہارے لئے بیئر کی بوتل لے آؤں؟ گرمی بڑی پڑ رہی ہے"

وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ "توبہ توبہ"

نوجوانی کے زمانے میں بھی اسے گیس کی ٹربل تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہر الا بلا چیز ہر وقت کھا لیتا تھا۔

پرانے ریڈیو سٹیشن کا زمانہ ہماری یاری دوستی کا بڑا خوبصورت اور ابتدائی زمانہ تھا۔ لباس کے بارے میں وہ لاپرواہ رہا ہے۔ مگر اس کی شخصیت میں بڑی کشش ہوا کرتی تھی۔ قد کاٹھ بھی مضبوط تھا۔ خوبصورت بھی تھا۔ بطور افسانہ نگار وہ مشہور بھی ہو گیا ہوا تھا۔ مگر لڑکیوں سے محبت کرنے کے معاملے میں وہ بہت پیچھے تھا۔ میں دیکھا کرتا کہ عورتوں کے ساتھ' خاص طور پر لڑکیوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا مشفقانہ ہوتا تھا یعنی وہی ہدایتیں اور تلقین

——— ! ایک لحاظ سے یہ اچھی بات بھی تھی۔ کم از کم وہ عشق کی بک بک سے بچ گیا تھا۔ کنواری شریف زادیوں کی طرح اسے بھی اپنی بدنامی اور نیک نامی کا بہت زیادہ خیال لگا رہتا تھا۔

ایک بار مجھے ایک لڑکی نے کہا کہ اگر مجھ سے ملنا ہے تو رات کے ٹھیک بارہ بجے ہماری کوٹھی کی عقبی دیوار پھاند کر آ جاؤ۔ میں نے فوراً کہا۔ آ جاؤں گا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اشفاق احمد لیل و نہار کا ایڈیٹر ہوا کرتا تھا۔ میں اس کے دفتر میں بیٹھ کر اس لڑکی سے فون پر باتیں کیا کرتا تھا۔ میں نے اشفاق سے کہا کہ میں آج رات اس لڑکی کے گھر دیوار پھاند کر جا رہا ہوں۔ اشفاق احمد نے لکھتے لکھتے قلم رکھ دی اور میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کمینے! اس حرکت سے باز آؤ۔ اگر پکڑے گئے تو جانتے ہو کتنی بے عزتی ہو گی۔ تمہارے سسرال والے کیا کہیں گے؟"

میں نے کہا۔

"اس لڑکی نے مجھے چیلنج کیا ہے کہ اگر ملنا ہے تو رات کو دیوار پھاند کر آ جاؤ۔ اب میں پیچھے ہٹا تو یہ میری بے عزتی ہے"

اشفاق نے مجھے بڑا سمجھایا۔ ڈانٹا۔ برا بھلا بھی کہا بڑی ہدایتیں کیں۔ مگر میں اپنی جگہ پر قائم رہا۔ میں دن کے وقت جا کر کوٹھی کی دیوار کا جائزہ لے آیا۔ دیوار ڈیڑھ مرد اونچی تھی۔ اس پر میں صرف کسی دوست کے کاندھوں پر پاؤں رکھ کر ہی چڑھ سکتا تھا۔ اس کام کے لئے میں نے ابن انشاء کا انتخاب کیا۔ اس سے بات کی تو وہ بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ دیوار پھاندوں گا"

رات کے بارہ بجے تک میں اور ابن انشاء مال روڈ پر پھرتے رہے۔ اس کے بعد ہم مذکورہ کوٹھی کی طرف گئے اور میں اس کے کاندھوں پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھ گیا اور دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ بہر حال دوسرے دن میں نے اشفاق کو رات کی داستان سنائی تو اس نے ایک بار پھر مجھے ڈانٹا اور

کہا:

"کانوں کو ہاتھ لگاؤ۔ آئندہ یہ حرکت نہیں کرو گے"

میں نے اس کے سامنے کانوں کو ہاتھ لگا دیئے۔

ابھی میں آپ کو پرانے ریڈیو سٹیشن کے زمانے کی باتیں ہی سنانا چاہتا ہوں۔ وہ بڑا خوبصورت اور بھرپور جذبوں کا زمانہ تھا۔ اشفاق احمد نے ریڈیو پر "تلقین شاہ" کی سیریز شروع کر دی۔ ایک تو وہ بڑا اچھا ادیب تھا۔ دوسرے اس نے تلقین شاہ کا کردار خود ادا کیا۔ یہ سونے پر سہاگہ والی بات ہو گئی۔ پہلے براڈ کاسٹ پر ہی "تلقین شاہ" مشہور ہو گیا۔ اشفاق نے اپنے پنجابی لہجے میں روہتک حصار کا لہجہ شامل کر لیا تھا۔ جو لوگوں میں بڑا مقبول ہو گیا۔ ایک بار اشفاق نے مجھے بتایا تھا کہ لوگ اسے روہتک حصار کا لہجہ سمجھتے ہیں۔ اصل میں یہ ہوشیارپور کے گردو نواح کا لہجہ ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اشفاق احمد جب اس لہجے میں ریڈیو پر بولتے تو تلقین شاہ کا کردار زندہ ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ اس کا یہ فیچر آج بھی کبھی کبھار اسلام آباد ریڈیو سے سننے میں آ جاتا ہے۔ یہ فیچر مجھے اس وقت بھی بہت پسند تھا اور آج بھی میں اسے بڑے شوق سے سنتا ہوں۔ اگر میں لکھ رہا ہوتا ہوں تو کام چھوڑ دیتا ہوں۔ "تلقین شاہ" کے علاوہ اشفاق ریڈیو کے لئے ڈرامے بھی لکھتا۔ مختلف موضوعات پر تقریریں بھی نشر کرتا اور ادب کے میدان میں بھی وہ منزلوں پر منزلیں طے کرتا جا رہا تھا۔ اس کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کا حلقہ اثر وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ لیکن اس کے دوستوں کا حلقہ مجھے اور دو ایک اور ادیبوں کو نکال کر زیادہ تر غیر ادبی لوگوں پر مشتمل تھا۔ میرا تو اٹھنا بیٹھنا اپنے شاعر اور ادیب دوستوں میں تھا جبکہ اشفاق احمد کا اپنا الگ حلقہ یاراں تھا۔ شاعروں ادیبوں سے اس کی ملاقات خاص خاص فنکشن میں ہی ہوتی تھی۔ قلندرانہ شان والے شاعروں اور ادیبوں سے اشفاق بڑا محتاط ہو کر ملتا۔ اس زمانے میں ہی اشفاق احمد بڑا پھونک پھونک کر قدم

رکھنے کا عادی تھا۔ اسے اپنے سوشل سٹیٹس کا ہروقت بڑا خیال رہتا تھا۔ اس کا زیادہ اٹھنا بیٹھنا سرکاری افسروں کے ساتھ ہو گیا تھا۔ ادیبوں شاعروں میں بھی ان ادیبوں شاعروں سے وہ بڑا خوش ہو کر ملتا جو سرکاری افسر تھے۔ اس کی یہ بات مجھے اس لئے بھی اچھی نہیں لگتی تھی کہ وہ مجھ سے دور ہو جاتا تھا۔

ابن انشاء تو پھر بھی ایک بار میرے ساتھ ہیرا منڈی کی سیر کرنے چل پڑا تھا مگر اشفاق احمد کا تو وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اسے کبھی ہیرا منڈی کا گانا سننے یا یونہی سیر کرنے جانے کے لئے کہا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ میرے حساب سے وہ اس ماحول کا آدمی نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں اسے زبردستی کبھی ہیرا منڈی لے جاتا تو ہیرا منڈی کے ماحول کو سخت تکلیف ہوتی۔ اپنا اپنا ماحول ہوتا ہے۔ اپنی اپنی تکلیف ہوتی ہے۔ جس کو قدرت نے جس ماحول کے لئے پیدا کیا ہے اسے اسی ماحول میں رہنا چاہیے۔

اب میں آپ کو اشفاق احمد کے ایک رومان کی کہانی سناتا ہوں۔ لیکن یہ یک طرفہ رومان تھا۔ یعنی لڑکی کو اشفاق احمد سے محبت تھی اشفاق احمد کا اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ پرانے ریڈیو سٹیشن کے زمانے کی بات ہے۔ مجھے یاد نہیں رہا اشفاق احمد کا کوئی افسانہ ادب لطیف یا شاید کراچی کے کسی پرچے میں چھپا اس افسانے کو پڑھ کر ایک لڑکی اشفاق احمد سے محبت کرنے لگی۔ یہ لڑکی لاہور کے ایک کالج کی سٹوڈنٹ تھی۔ میں اس کا اصلی نام نہیں لکھوں گا۔ کالج کا نام بھی نہیں لکھوں گا۔ آپ اس کا کوئی نام رکھ لیں۔ چلیں خالدہ رکھ لیتے ہیں۔ اشفاق کو اس قسم کے پرانے نام پسند بھی ہیں۔ ایک دن کی بات ہے۔ میں پرانے ریڈیو سٹیشن پر آیا تو مجھے کسی پروڈیوسر نے بتایا کہ اشفاق صاحب آئے ہوئے ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے اسے ریڈیو سٹیشن کے تمام کمروں اور سٹوڈیوز میں دیکھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے سوچا کینٹین میں چل کر دیکھنا چاہیے۔ وہاں آیا تو میں نے دور سے دیکھا کہ اشفاق ایک لڑکی کے پاس بیٹھا ہے۔ لڑکی چائے بنا رہی ہے اور وہ کسی بات پر ہنس رہا ہے۔ میرے لئے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ کالج کی لڑکیاں 'معزز خواتین' اور ریڈیو کی آرٹسٹیں وغیرہ اکثر اشفاق کے پاس دیکھی جاتی تھیں۔ اشفاق نے مجھے دیکھا تو اشارے سے بلا لیا۔ میں قریب گیا تو کہنے لگا۔

"آؤ اوئے کشمیری تم بھی چائے پیو۔"

پھر اس نے لڑکی سے میرا تعارف کرایا۔ اس لڑکی کا نام خالدہ تھا اور وہ لاہور کے ایک کالج میں بی۔ اے یا شاید ایف۔ اے کی سٹوڈنٹ تھی۔ بڑی شریف سادہ سی لڑکی تھی۔ اس زمانے میں قرمزی رنگ کے ٹیڈی کپڑوں کا عورتوں میں بڑا فیشن تھا۔ مگر اس لڑکی کا لباس ٹیڈی نہیں تھا۔ سر پہ دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ شکل و صورت اچھی تھی۔ وہ سر جھکائے چائے بنا رہی تھی۔ اشفاق نے میرا تعارف کرایا تو لڑکی نے چہرہ اٹھا کر تھوڑی دیر کے لئے میری طرف دیکھا اور دوبارا چائے بنانے میں مصروف ہو گئی۔ وہ چائے اس اہتمام سے بنا رہی تھی جیسے کسی مریض کے لئے نسخے کے مطابق دوا تیار کر رہی ہو۔ میں نے کوئی زیادہ اہمیت نہ دی۔ اور اشفاق سے کسی پروگرام کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

میں نے محسوس کیا کہ اشفاق احمد میری باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دے رہا۔ میری بات پر ہوں ہاں کہہ کر وہ اس لڑکی کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ لڑکی کے ساتھ اس کا انداز بڑا مربیانہ اور مشفقانہ تھا۔ یہ بھی میرے لئے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ لیکن میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ اشفاق احمد لڑکی سے باتیں کرتے کرتے کچھ نروس سا ہو جاتا ہے۔ یہ ضرور انوکھی بات تھی۔ کیونکہ میں نے اسے کبھی کسی عورت کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے نروس ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی میں نے کوئی زیادہ خیال نہ کیا۔ لڑکی یعنی خالدہ افسانوں' افسانہ نگاروں' ریڈیو کے پروگراموں اور درسی کتابوں کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ پھر وہ اجازت لے کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اشفاق

احمد نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرے اور چائے کا لمبا گھونٹ بھرنے کے بعد بولا۔

"یار! یہ لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔

"کیوں؟ کوئی خاص بات ہوئی ہے"

اشفاق اپنے مخصوص انداز میں ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

"او نہیں کمینے! ایسی کوئی بات نہیں ہے"

میں نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتہ ہے ایسی بات ہو ہی نہیں سکتی"

اشفاق نے موضوع بدل دیا۔ ہم ریڈیو پروگراموں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ جامن کے درختوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے جو ریڈیو سٹیشن کی کوٹھی کے پہلو میں دیوار کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ خالدہ کا نہ مجھے خیال آیا نہ اشفاق نے اس کا کوئی ذکر کیا۔ ایک دن میں ریڈیو سٹیشن آیا تو عادت کے مطابق سیدھا کینٹین کی طرف چل دیا۔ کیونکہ وہاں مجھے میرے میوزیشن دوستوں میں سے کوئی نہ کوئی مل جاتا تھا اور میری خواہش ہوتی تھی کہ ریڈیو سٹیشن پر چائے کی پہلی پیالی کسی سُر کے گیانی کے ساتھ پیوں۔ اشفاق روز نہیں آتا تھا۔ ورنہ اس کے ساتھ چائے پی کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ میرا شروع ہی سے بے تکلف یار بن گیا تھا۔ اور پھر مجھے وہ بڑا اچھا لگتا تھا۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ مجھے اس سے پیار ہو گیا تھا۔ یہ پیار آج بھی اسی شدت کے ساتھ قائم ہے اور آج بھی میری خواہش ہوتی ہے کہ کہیں سے کوئی گاڑی مل جائے تو میں اشفاق کے گھر جاؤں اور اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیوں۔ باتیں کروں۔ اس کی باتیں سنوں اور پھر واپس آ جاؤں۔ یہ محبت کے معاملات ہیں اور ان معاملات کو صرف محبتیں کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دوستیاں کرنے والے نہیں سمجھ سکتے۔ اور میں بنیادی

طور پر محبت کا آدمی ہوں۔ دوستی نبھانے کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔ جتنے دوست بنائے۔ سب ایک ایک کر کے میرے دشمن بن گئے۔

میں پھر محبت کی طرف آتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی ریڈیو کی کینٹین میں کونے والی گول میز کے سامنے کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی ہے۔ میں واپس مڑنے لگا تو مجھے خیال آیا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو ہفتہ پہلے اشفاق سے ملنے آئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا کینٹین میں آیا تو دیکھا کہ وہ خالدہ ہی تھی۔ وہ کتاب پڑھنے میں منہمک تھی۔ میں نے کہا۔

"آپ کو اشفاق صاحب سے ملنا ہے؟"

خالدہ نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اس نے مجھے سلام کیا اور پوچھا۔

"کیا اشفاق صاحب آ گئے ہیں؟"

میں کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"وہ تو ہفتے میں دو ایک بار آتا ہے اور وہ بھی زیادہ تر شام کو۔ پتہ نہیں۔ شاید آ جائے۔"

میں نے چائے کا آرڈر دیا تو وہ جلدی سے بولی۔

"جی نہیں شکریہ۔ میں چائے نہیں پیوں گی"

"تھوڑی سی پی لیں۔ کوئی بات نہیں۔ شاید اشفاق آ جائے"

اس نے کتاب بند کر دی اور کینٹین کی چھت کی طرف نگاہیں اٹھا کر جائزہ لیا اور بولی۔

"یہ لوگ صفائی کا خیال کیوں نہیں رکھتے"

میں نے سگریٹ سلگایا۔ اس زمانے میں میں کیپسٹن سگریٹ پیا کرتا تھا جو بڑا اچھا سگریٹ ہوتا تھا۔ میں اس سے کالج کی پڑھائی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ زیادہ تر میری باتوں کا مختصر سا جواب دیتی۔ اس کی نظریں بار بار وہاں سے نظر آنے والے ریڈیو سٹیشن کے آہنی گیٹ کی طرف اٹھ رہی تھیں جو اگرچہ بند

تھا مگر اس کی سلاخوں میں سے باہر سڑک پر آتے جاتے لوگ صاف نظر آ رہے تھے۔ یقیناً وہ اس انتظار میں تھی کہ شاید اشفاق آ جائے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے اشفاق سے کوئی ریڈیو کے بارے میں کام ہے؟ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔ دراصل مجھے ان کے ایک افسانے کے بارے میں کچھ معلومات چاہیے تھیں۔"

اس کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اصل بات کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے زیادہ کریدنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چائے آ گئی۔ وہ چائے بنانے لگی تو میں نے اسے روک دیا اور کہا کہ میں بناتا ہوں۔ کیونکہ میرا تجربہ تھا اور تجربہ ہے کہ ہمارے ہاں کی 95 فی صد خواتین کو چائے بنانی نہیں آتی۔ جو پانچ فی صد اچھی چائے بناتی ہیں ان سے کہیں سو دو سو سال کے بعد جا کر ملاقات ہوتی ہے۔ ہم چائے پیتے رہے اور ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتے رہے۔ اشفاق نہ آیا۔ خالدہ چلی گئی۔ دوسرے روز اشفاق سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے کہا کہ خالدہ تم سے ملنے آئی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔

"وہ کیوں آئی تھی؟"

میں نے کہا۔

"وہ تمہارے کسی افسانے کے بارے میں تم سے کوئی بات پوچھنا چاہتی تھی"

اشفاق کے چہرے پر سرخی آ گئی۔ وہ کچھ جھینپ سا گیا۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ اور کہا۔

"جلدی سے مجھے خوش خبری سناؤ کہ تمہیں اس سے محبت ہو گئی ہے"

اشفاق نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔

"او نہیں یار۔ ہمیں کہاں کسی سے محبت ہو سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"اچھا تو پھر خدا کے لئے اس سے ضرور مل لو۔ وہ تم سے ملنے کو سخت بے تاب تھی۔ مجھے تو لگتا ہے۔ وہ تم سے محبت کرنے لگی ہے"

اشفاق میری طرف جھکا پھیکی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

"او نہیں یار۔ تم احمق ہو۔ تم ان بھولی بھالی لڑکیوں کو نہیں جانتے بس انہیں کوئی نہ کوئی کمپلیکس ہو جاتا ہے۔ چلو اوپر چلتے ہیں شاد امرتسری کے پاس"

میں نے کہا۔ "چائے آ رہی ہے؟"

وہ اوپر جانے والے زینے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"اسے کہو اوپر لے آئے"

اشفاق احمد ابھی تک سمن آباد والے گھر میں نہیں آیا تھا۔

ایک روز کی بات ہے کہ میں پاک ٹی ہاؤس میں اپنے شاعر ادیب دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ کاؤنٹر پر رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ علیم صاحب نے میری طرف دیکھ کر اشارہ کیا کہ تمہارا فون آیا ہے۔ یہ فون خالدہ نے کیا تھا۔ پہلے تو میں نے اس کی آواز نہ پہچانی۔ جب اس نے بتایا کہ میں خالدہ بول رہی ہوں تو میں نے پہلا سوال یہ کیا کہ خیریت ہے؟ کہنے لگی۔

"مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں"

میں نے کہا۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"جی نہیں۔" خالدہ کی ہنسی کی آواز آئی۔

میں نے کہا۔

"پاک ٹی ہاؤس آ جاؤ۔ میں اس وقت یہیں بیٹھا ہوں۔"

وہ کہنے لگی۔

"نہیں۔ یہاں نہیں۔ آپ ایسے کیوں نہیں کرتے۔ تھوڑی دیر کے لئے لارنس باغ والے اوپن ایئر کیفے میں آ جائیں۔ میں بھی کالج سے وہاں آ جاتی ہوں۔"

میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ پندرہ منٹ بعد پہنچ رہا ہوں"

پندرہ منٹ بعد میں لارنس باغ میں تھا۔ بہار کا موسم تھا۔ یعنی اپریل شروع ہو چکا تھا۔ پھول کھل رہے تھے۔ فضا میں سبزے اور پھولوں کی ملی جلی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ روشن روشن دھوپ چاروں طرف نکلی ہوئی تھی۔ فضا میں ہلکی ہلکی گرمائش تھی جو جسم کو بڑی اچھی لگ رہی تھی اور کیپسٹن کے سگریٹ کا مزا دوبالا ہو گیا تھا۔ لارنس باغ کے اوپن ایئر کیفے میں ایک سبز رنگ کا لکڑی کا کیبن ہوا کرتا تھا۔ اس کی کھڑکی کھلی رہتی تھی۔ خالدہ مجھے کھڑکی میں سے اندر بیٹھی نظر آئی۔ میں کیبن میں آ گیا۔

خالدہ نے کھڑکی کا پردہ کھول دیا۔

کہنے لگی۔

"میں کالج سے آ رہی ہوں۔ آج دو پیریڈ خالی تھے۔"

اس کی دو کتابیں اور ایک کاپی میز پر پڑی تھی۔ بیرا آیا۔ میں نے اسے چائے کا آرڈر دیا اور موسم کے بارے میں دو تین باتیں کرنے کے بعد پوچھا۔

"اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

خالدہ کے چہرے پر حیا کی سرخی سی دوڑ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ معمہ کیا ہے۔ اتنا ضرور مجھے شک ہو گیا تھا کہ یہ لڑکی اشفاق کو اچھا سمجھتی ہے اور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اس سے ملنے ریڈیو سٹیشن آ جاتی ہے۔

کہنے لگی۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس آپ سے یہی پوچھنا تھا کہ اشفاق

صاحب تو بڑے مصروف آدمی ہیں۔ ان سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ فون پر بھی نہیں ملتے۔ آپ ہی مجھے ان کے افسانوں کے بارے میں کچھ بتا دیں۔ دراصل میں ان پر ایک مضمون لکھنا چاہتی ہوں"

معمہ حل ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اصل بات کیا ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بی بی! جو بات تمہارے دل میں ہے اور جسے تم مجھ سے چھپا رہی ہو وہ بتاؤ۔"

خالدہ چپ ہو گئی۔ اس کے چہرے پر گہری متانت آ گئی۔ بیرا چائے رکھ کر چلا گیا۔ وہ چائے بنانے لگی تو میں نے اسے روک دیا۔

"میں بناتا ہوں۔ تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا"

وہ کتاب کھول کر اس کے ورق الٹتے ہوئے بے نیازی سے بولی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ مجھے اشفاق صاحب کے افسانے بہت اچھے لگتے ہیں"

"اور اشفاق صاحب؟" میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔ خالدہ منہ دوسری طرف کر کے کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ کھڑکی کا پردہ درمیان سے کافی کھلا ہوا تھا اور اس میں سے باغ کے درخت اور تھوڑا سا نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔ میں نے چائے کی پیالی خالدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے دل میں جو کچھ ہے وہ مجھے بتا دو۔ اشفاق کو میں بڑی اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ اگر تم کہو گی تو میں اس سے کوئی بات نہیں کروں گا"

اب جو خالدہ نے میری طرف گردن گھما کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ میں وہیں گم سم سا ہو کر رہ گیا۔ معاملے کی نوعیت کو میں بہت کچھ سمجھ چکا تھا مگر معاملہ اتنا آگے بڑھ چکا ہو گا اس کا مجھے گمان تک

نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں۔ کیا کروں۔ بس یہی کہا۔

"ارے! تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے؟"

خالدہ مسکرا دی۔ یہ بڑی اداس بڑی غم زدہ مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگی۔

"اشفاق صاحب مجھ سے فون پر بات کیوں نہیں کرتے؟ میں جب بھی فون کرتی ہوں وہ یہ کہہ کر فون بند کر دیتے ہیں کہ بی بی بڑے ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ پھر فون کر لینا۔"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"تم فون کیوں کرتی ہو؟ ریڈیو سٹیشن آ کر زبانی بات کر لیا کرو۔"

وہ گہرا سانس بھر کر بولی۔

"آپ کو معلوم نہیں۔ انہوں نے مجھے ریڈیو سٹیشن آنے سے منع کر دیا ہے"

وہ کس لئے میں نے پوچھا۔

خالدہ نے کہا۔

"بس۔ یہ ان کو معلوم ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"اچھا تو جو تمہیں معلوم ہے وہ مجھے بتاؤ۔ کیا تم اشفاق سے پیار کرنے لگی ہو؟"

خالدہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے سر جھکا لیا اور کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔ میں نے جب ہنستے ہوئے اپنا سوال دہرایا تو اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے"

میں نے کہا۔

"یہ اچھی بات ہے۔"

خالدہ نے از خود موضوع بدل دیا اور دوسری باتیں کرنے لگی۔ بیرا برتن اٹھانے آیا تو میں نے اسے بل لانے کو کہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ خالدہ مجھ سے اشفاق کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔ اپنے دل کا حال کھول کر میرے آگے بیان کرنا چاہتی ہے۔ مگر شرم اور حیا دامن گیر تھی۔ میں نے بھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ ہم کیبن سے نکل آئے اور لارنس باغ کی اس سڑک پر چلنے لگے جو لارنس روڈ کی طرف جاتی ہے۔ کیونکہ خالدہ نے واپس کالج جانا تھا۔ لارنس روڈ والے گیٹ پر میں خالدہ سے جدا ہو گیا۔

شام کو پاک ٹی ہاؤس میں اشفاق احمد سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے سارا قصہ سنایا۔ وہ پہلے تو بڑا حیران ہوا۔ پھر گردن کو جھٹک کر بولا۔

"بڑی پاگل لڑکی ہے"

میں نے کہا۔

"وہ تم سے محبت کرنے لگی ہے۔ میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اس کا دل نہ توڑو۔ وہ مجھے بڑی حساس لڑکی لگتی ہے۔ ویسے بھی محبت کرنے سے تمہارے اندر ایک اچھی تبدیلی آ جائے گی۔ پھر تم بھی رومانٹک افسانے لکھنے لگو گے"

وہ ہنس رہا تھا۔

"نہیں یار! میں اس بک بک میں نہیں پڑنا چاہتا۔ خواہ مخواہ بدنامی ہو گی"

میں نے کہا۔

"تم تو بالکل لڑکیوں ایسی باتیں کرتے ہو۔ تمہاری بدنامی کیسے ہو گی؟"

اشفاق نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو یار۔ کوئی اور بات کرو۔ یہ بتاؤ ابن انشاء کراچی سے کب آ رہا ہے"

جس بات کا مجھے ڈر یا خیال تھا وہی بات ہوئی۔ اشفاق عشق محبت کے
جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ یہ بات اس کی طبیعت کے خلاف تھی۔ میں
نے بھی اس موضوع پر دوبارا اس سے بات نہ کی۔ کبھی کبھی اسے چھیڑتا ضرور
تھا۔ وہ ہنس دیتا تھا۔ خالدہ سے بھی پھر ملاقات نہ ہوئی۔ ایک دن میں نے
اشفاق سے پوچھا۔

"خالدہ کا فون تو نہیں آتا؟"

کہنے لگا۔

"ریڈیو سٹیشن پر آیا کرتا تھا۔ میں نے اسے منع کر دیا۔ اب فون
نہیں آتا۔"

میں نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔

"تم بڑے ظالم ہو اشفاق! ایک لڑکی تم سے اتنا پیار کرتی ہے اور تم
اس سے بات تک نہیں کرتے"

وہ بولا۔

"بھا جی! جس پنڈ جانا ہی نہیں پھر اس پنڈ کا راہ کیوں پوچھوں؟ یہ
کام تم کرو۔ ہاں"

دو مہینے گزر گئے۔ اس دوران نہ تو خالدہ نے مجھے پاک ٹی ہاؤس فون کیا
اور نہ ریڈیو سٹیشن آئی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ میرے ذہن سے بھی وہ تقریباً اتر
گئی۔ مجھے اپنی محبتوں سے فرصت نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کہ سال ڈیڑھ
سال گزر گئے ہوں گے کہ ایک روز مجھے پاک ٹی ہاؤس ایک لڑکی نے فون کیا۔
اس نے اپنا نام نسرین بتایا۔ کہنے لگی۔

"آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں خالدہ کی گہری سہیلی ہوں"

میں نے فوراً پوچھا۔

"اچھا اچھا۔ کیا حال ہے خالدہ کا؟"

دوسری طرف تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ میں نے ہیلو کیا تو دوسری

طرف سے اجنبی لڑکی نے کہا۔

"میں فون پر آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔ آپ پلیز مجھے کسی جگہ
ملیں۔ مجھے آپ سے بڑی ضروری بات کرنی ہے۔"

میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

"خیریت تو ہے نا؟"

"بس آپ مجھے آج ہی کسی وقت ملیں۔ یہ خالدہ کی زندگی اور موت
کا معاملہ ہے۔"

میں نے فوراً کہہ دیا۔

"میں اوپن ایئر کیفے لارنس باغ ابھی آتا ہوں۔ تم بھی آ جاؤ۔ یہ
کیفے دیکھا ہے نا تم نے؟"

"جی ہاں۔ میں آ رہی ہوں"

دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔

○

میں نے بھی ریسور رکھ دیا۔

قدرتی طور پر مجھے پریشانی سی لگ گئی کہ خدا خیر کرے۔ میں اسی وقت ٹی ہاؤس سے باہر نکلا۔ تانگہ کرایا اور سیدھا لارنس باغ جس کا نام آج کل باغ جناح ہے کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ ان دنوں مال پر تانگے چلا کرتے تھے۔ ویسے بھی رش نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔ نہ ویگن نہ رکشا' نہ سکوٹر۔ کبھی کبھار ہی کوئی موٹر یا ٹرائف قسم کی موٹر سائیکل گزرتی تھی۔

میں لارنس باغ کی سڑک پر تیز تیز قدموں سے چلتا اوپن ایئر کیفے پہنچا۔ کیفے کی کرسیاں تقریباً خالی تھیں۔ میں نے کیبن کی کھڑکی پر نظر ڈالی۔ کیبن بھی خالی تھا۔ نسرین ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں نے اس لڑکی کا نام بھی فرضی لکھا ہے۔ نسرین کا اصلی نام کچھ اور تھا۔ میں لان کے کونے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں لارنس روڈ والے گیٹ کی طرف لگی تھیں۔ نہ جانے کیوں میرا خیال تھا کہ نسرین بھی اسی گیٹ کی طرف سے آئے گی۔ مگر وہ مال روڈ والے گیٹ کی طرف سے آئی۔ ایک لڑکی کو میں نے دیکھا کہ نسواری رنگ کا برقعہ پہنے ہاتھ میں کتابیں پکڑے چلی آ رہی ہے۔ اس نے نقاب الٹ رکھا تھا۔ وہ پلاٹ میں سے ہو کر سیدھی میرے پاس آ گئی۔ اس نے میرا نام لیا۔

"میں نے نقوش رسالے میں آپ کی تصویر دیکھی تھی۔"

میں اسے لے کر کیبن میں آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"خیریت تو ہے؟"

یہی سوال کر سکتا تھا۔ نسرین کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ دبلی پتلی سانولے رنگ کی لڑکی تھی۔ چہرے پر ذہانت کی چمک تھی۔ کہنے لگی۔

"خالدہ نے مجھے آپ کے بارے میں بھی بہت کچھ بتا دیا ہوا ہے۔ اس لئے میں آپ کے پاس آئی ہوں۔ خالدہ نے اپنا برا حال کر لیا ہے۔ گھر والے اس کی شادی طے کر چکے ہیں مگر وہ خودکشی کا فیصلہ کر چکی ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے ڈر لگا تھا کہ کہیں یہ لڑکی مجھے یہ نہ بتائے کہ خالدہ نے خودکشی کر لی ہے۔ ایسی بات نہیں تھی خالدہ نے خودکشی کا فیصلہ ہی کیا تھا۔ اور خودکشی کا فیصلہ کرنے والے خودکشی نہیں کیا کرتے۔ خودکشی فیصلہ کرنے سے پہلے کی جاتی ہے۔ اور محبت کے معاملے میں جذباتی لڑکیاں عام طور پر اس قسم کی باتیں کیا ہی کرتی ہیں۔ میں نے نسرین سے پوچھا۔

"وہ ایسا کیوں کرنا چاہتی ہے؟"

مجھے اس کی وجہ معلوم تھی مگر میں نسرین کی زبانی بھی سننا چاہتا تھا۔ کہنے لگی۔

"آپ کو تو سب حالات کا علم ہے۔ خالدہ اشفاق صاحب سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ یہ روحانی محبت ہے۔"

"روحانی محبت؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں!" نسرین نے کہا۔ "خالدہ یہی کہتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں نے روحانی طور پر اشفاق صاحب سے شادی کر لی ہوئی ہے۔ اب اگر گھر والوں نے میری کسی دوسری جگہ شادی کر دی تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"زہر اتنی آسانی سے نہیں ملتا"

نسرین بولی۔

"وہ کہتی ہے میں ڈی ڈی ٹی پی لوں گی"

میں نے کہا۔

"وہ پاگل ہے۔ اگر اسے اشفاق سے روحانی محبت ہے تو پھر خودکشی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ روح تو لطیف ہوتی ہے وہ کسی دوسرے آدمی سے شادی کرنے کے باوجود بھی روحانی طور پر کسی سے اپنی محبت نبھا سکتی ہے"

نسرین کہنے لگی۔

"خدا کے لئے آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں خالدہ کو جانتی ہوں۔ وہ بڑی حساس لڑکی ہے۔ وہ جو فیصلہ کرتی ہے۔ پھر اس پر عمل کر کے ہی رہتی ہے۔ وہ ضرور خودکشی کر لے گی"

میں نے کہا۔

"تو بی بی! پھر میں کیا کروں؟ مجھے بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

نسرین نے کہا۔

"میں اس لئے آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ کو بتاؤں کہ آپ کیا کر سکتے ہیں"

"ہاں! مجھے بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

نسرین کہنے لگی۔

"کسی طرح اشفاق صاحب کو راضی کریں کہ وہ ایک بار خود خالدہ سے مل کر اسے سمجھائیں وہ نہ میری بات مانتی ہے نہ آپ کی بات مانے گی۔ صرف اشفاق صاحب ہی اسے خودکشی کے فیصلے سے روک سکتے ہیں۔ آپ یقین کریں خالدہ بڑی ضدی لڑکی ہے۔ وہ جان دے دے گی مگر شادی نہیں کرے گی"

میں نے کہا۔

"تم کسی طرح اس کے گھر والوں سے کہہ کر شادی رکوا نہیں سکتیں؟"

"یہ کام میرے بس میں نہیں ہے۔ اور پھر اس کی شادی کا فیصلہ گھر کے بڑے بزرگوں نے کیا ہے اور ہمارے خاندانوں میں شادی کا فیصلہ بزرگ ہی کرتے ہیں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ نسرین بھی چپ سی ہو گئی۔ پھر اس نے بڑی رحم طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"میری سہیلی کی زندگی آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ پلیز آپ اشفاق صاحب سے کہیں کہ وہ خالدہ سے مل کر اسے سمجھائیں۔ وہ ان کی بات ضرور مان جائے گی"

میں نے کہا۔

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مجھے بتاؤ خالدہ کہاں مل سکتی ہے۔ میں وہاں اشفاق کو لے کر آ جاؤں گا۔"

طے یہ پایا کہ دوسرے روز دن کے دس بجے نسرین خالدہ کو لے کر پنجاب پبلک لائبریری کے گیٹ پر آئے گی۔ وہاں سے ہم لوگ کسی جگہ جا کر بیٹھ جائیں گے۔

"میں وہیں لائبریری میں ہی بیٹھوں گی۔ آپ چاہیں تو اشفاق صاحب کے ساتھ ہی گفتگو میں شریک ہو جائیں۔ اگر چاہیں تو ان دونوں کو اکیلا باتیں کرنے دیں۔ آپ بھی میرے ساتھ لائبریری میں ہی رہیں۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں"

میں نے کہا۔

"اس کا فیصلہ بعد میں ہو جائے گا تم کل پورے دس بجے دن پنجاب پبلک لائبریری پہنچ جانا۔ میں وہاں تمہارا انتظار کروں گی"

"اور اشفاق صاحب؟" نسرین نے پوچھا۔

"وہ میرے ساتھ ہو گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

نسرین کو رخصت کرنے کے بعد میں اشفاق احمد کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ مزنگ روڈ پر اس کے مکان پر گیا وہ وہاں نہیں تھا۔ ٹی ہاؤس میں بھی نہیں تھا۔ وہاں سے میں آرٹسٹ زیدی کے سٹوڈیو ہیڈن روڈ پر آ گیا۔ زیدی صاحب نے بتایا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے آیا تھا کہہ رہا تھا کہ میں اپنے ایک عزیز سے ملنے جا رہا ہوں۔ وہاں سے میں ریڈیو سٹیشن چلا آیا۔ مجھے ایک تقریر کی ریکارڈنگ کروانی تھی۔ دوپہر کے بعد ریکارڈنگ سے فارغ ہو کر میں گھر چلا گیا۔

شام کو پاک ٹی ہاؤس گیا۔ اشفاق وہاں نہیں تھا۔ میں اس کے گھر گیا۔ وہ مجھے مل گیا۔ میں نے جب اسے سارا قصہ سنایا تو وہ پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ ایسا کرو تم اسے جا کر سمجھا دو۔ وہ تو احمق لڑکی ہے۔"

میں نے زور دے کر کہا۔

"تمہارا میرے ساتھ جانا بہت ضروری ہے۔ اور اس لڑکی نے کوئی ایسی ویسی حرکت کر لی تو اس کا سارا گناہ تمہارے سر پر ہو گا۔"

وہ میرا منہ تکنے لگا۔ پھر نفی میں سرہلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں یار نہیں۔ میں اس بک بک میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میری مانو۔ تم جا کر اس کو سمجھاؤ کہ بی بی اس قسم کی جذباتی باتیں نہیں کیا کرتے۔ ماں باپ جہاں کہتے ہیں وہاں شادی کر لو۔ یار مجھے تو اس لڑکی کے ساتھ کوئی محبت وغیرہ نہیں ہے۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

میں نے کہا۔

"تم نے افسانے کیوں لکھے تھے؟ اب اگر تمہارے افسانے پڑھ کر کسی لڑکی کو تم سے محبت ہو گئی ہے تو تمہارا فرض بنتا ہے کہ اگر

اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتے تو کم از کم اس کو برباد ہونے سے تو بچا لو"

اشفاق احمد سوچ میں پڑ گیا۔ بادل نخواستہ کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ میں مل لیتا ہوں اس سے کل کس وقت جانا ہو گا؟"

"نسرین اسے لے کر کل دس بجے پنجاب پبلک لائبریری کے گیٹ پر آئے گی"

"اور بیٹھیں گے کہاں؟ ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں ہمیں کوئی دیکھ نہ لے"

میں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"بس بس۔ اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ میں کر لوں گا کسی جگہ کا انتظام"

"یار کسی ہوٹل میں نہ رکھنا؟"

"فکر نہ کرو۔"

رات کو میں اپنے ایک دوست سے جا کر ملا جو وکالت کا امتحان دے رہا تھا اور اپنے فلیٹ میں اکیلا رہتا تھا۔ میں اس دوست کا نام بھی نہیں لکھوں گا اور یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ اس کا فلیٹ لاہور میں کس جگہ واقع تھا۔

بہرحال دوسرے دن میں اشفاق احمد کو لے کر پہلے اپنے دوست کے فلیٹ پر گیا۔ چابی میرے پاس تھی۔ فلیٹ کھول کر اشفاق کو وہاں بٹھایا اور کہا۔

"تم یہیں رہنا۔ میں خالدہ کو لے کر آتا ہوں۔"

اس وقت دن کے ساڑھے نو بجے تھے۔ وہاں سے میں سیدھا لائبریری آ گیا۔ ابھی دس بجنے میں دس بارہ منٹ باقی تھے۔ میں لائبریری میں جا کر اخبار وغیرہ دیکھنے لگا۔ مگر مجھے بے چینی لگی ہوئی تھی۔ کسی خبر پر نظر نہیں جم رہی تھی۔ فوراً باہر نکل آیا اور گیٹ کی ایک جانب درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ بار بار گھڑی دیکھتا۔ دس بج گئے دس بج کر دس منٹ ہو گئے۔ نسرین

خالدہ کو لے کر نہ آئی۔ دل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ کہیں میرے دوست کے فلیٹ سے اشفاق ہی نہ بھاگ جائے۔ خدا خدا کر کے مجھے دو لڑکیاں نظر پڑیں۔ ایک نے برقعہ پہن رکھا تھا۔ دوسری بغیر برقعے کے تھی۔ برقعے والی نسرین تھی اور اس کے ساتھ والی لڑکی خالدہ تھی۔

قریب آئیں تو میں نے دیکھا کہ خالدہ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے کافی کمزور ہو گئی تھی۔ میں درخت کی اوٹ سے نکل کر سامنے آگیا۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ پرانی انار کلی والے بازار سے ہمیں تانگہ مل گیا۔ ہم تانگے میں سوار ہو گئے۔ تانگہ مختلف بازاروں سے ہوتا ہوا جنگل پر پہنچ گیا۔ راستے میں ہم نے کوئی بات نہ کی۔ صرف خالدہ سے سرسری الفاظ میں اس کا حال پوچھا جس کا جواب اس نے دھیمی آواز میں جی "ٹھیک ہوں" دیا۔

سارا راستہ دل میں دعائیں مانگتا رہا کہ اشفاق فلیٹ پر موجود ہو۔ کہیں وہ فرار نہ ہو گیا ہو۔ خالدہ کی حالت واقعی بڑی خراب تھی۔ اس نے اشفاق کی روحانی محبت کو دل پر لگا لیا تھا۔ فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ اشفاق نے دروازہ کھولا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں اسے ایک طرف لے گیا۔

"خدا کے لئے لڑکی کی پوری دلجوئی کرنا۔ تم بڑی اچھی باتیں کر لیتے ہو اس کو بڑی محبت سے سمجھانا۔ لڑکی نادان ہے۔ اس سے یہی ایک غلطی ہوئی ہے کہ غلط آدمی کو دل دے بیٹھی ہے۔ اب تمہارا فرض ہے کہ اس کو اس طریقے سے ہینڈل کرنا کہ وہ باقی زندگی آرام اور سکون سے گذار سکے۔ میں اور نسرین لائبریری میں جا کر بیٹھیں گے"

اشفاق نے دبی زبان میں کہا کہ میں وہیں ٹھہروں۔ میں نے نفی میں گردن ہلائی اور نسرین کے قریب آ کر بلند آواز میں کہا۔

"چلو بھئی نسرین ہم ذرا لائبریری تک ہو آئیں۔ مجھے کچھ کتابیں نکلوانی ہیں او کے ڈیئر! گڈ لک ٹو یو"

میں اور نسرین کمرے سے نکل آئے۔ مجھے پتہ تھا کہ اشفاق دروازہ بند نہیں کرے گا۔ میں نے برآمدے میں آ کر پلٹ کر دیکھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں واپس گیا۔ اشفاق سے کہا۔

"بھائی جان اندر سے کنڈی لگا لو"

اور دروازہ بند کر دیا۔

وہاں سے میں اور نسرین پیدل ہی لائبریری کی طرف چل پڑے۔ اس زمانے میں لاہور بڑا تھوڑی آبادی والا شہر تھا۔ سڑک پر آج کی طرح ٹریفک کا شور ہنگامہ نہیں ہوتا تھا۔ ہم سڑک کے کنارے کنارے بڑے اطمینان سے باتیں کرتے جا رہے تھے۔ نسرین بار بار پوچھتی۔

"اشفاق صاحب اسے اچھی طرح سمجھائیں گے نا؟"

میں نے کہا۔

"اسے سمجھانا ہی تو آتا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ وہ بڑی اچھی طرح سمجھائے گا۔"

آتی دفعہ میں اشفاق کو کہہ آیا تھا کہ ہم ایک گھنٹے بعد آئیں گے۔ یہ ایک گھنٹہ میں اور نسرین نے لائبریری کی بجائے عجائب گھر کے کونے والے پلاٹ میں گھاس پر بیٹھ کر گذارا۔ اس کے بعد ہم نے تانگہ لیا اور واپس فلیٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ اشفاق احمد کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے اشفاق کی آواز آئی۔

"دروازہ کھلا ہے اندر آ جاؤ"۔

کیسا شریف آدمی ہے اشفاق احمد —— میرے کہنے پر اس نے دروازے کی کنڈی لگا لی تھی۔ مگر میرے جاتے ہی اس نے کنڈی کھول دی

تھی۔ بھلا ایسے آدمی کو کوئی عورت گوارا کر سکتی ہے؟ خدا جانے اس لڑکی خالدہ پر کون سا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ میں اور نسرین کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ خالدہ کا موڈ بدلا ہوا تھا۔ چہرے پر پہلے والی پژمردگی اور ویرانی غائب تھی۔ اشفاق ہنس کر کہنے لگا۔

"لو بھئی! سارا معاملہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ یہ تو بڑی بھولی بھالی لڑکی ہے۔ چل لڑکیے اب مسکراؤ۔"

خالدہ واقعی مسکرانے لگی۔ نسرین تو اس سے لپٹ گئی۔ وہ خالدہ کی واقعی بڑی جگری دوست تھی۔ خالدہ کی بدلی ہوئی کیفیت دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ میں نے بھی سکھ کا سانس لیا کہ ایک انجان لڑکی اناڑی عاشق کے ہاتھوں مرنے سے بچ گئی۔ فلیٹ سے نکل کر میں نے خالدہ اور نسرین کو ایک تانگے پر بٹھایا۔ خالدہ نے مسکراتے ہوئے مجھے اور اشفاق کو سلام کیا۔ اس کے بعد ہم پیدل چل پڑے میں نے پہلا سوال اشفاق سے یہ کیا کہ اس نے خالدہ پر کون سا جادو پھونکا ہے۔ اشفاق دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو بجاتے ہوئے بولا۔

"بس کاکا! اس علم سے تم بے خبر ہو"

میں وہیں فٹ پاتھ پر رک گیا۔ اشفاق کو گھور کر دیکھا تو اس نے فوراً کانوں کو پکڑ لیا اور بولا۔

"خدا گواہ ہے۔ اس بات کا تصور بھی نہ کرنا"

"وہ تو میں نہیں کرتا۔ مگر تمہارے انداز سے لگتا ہے کہ ---"

"توبہ توبہ!"

اشفاق بار بار کانوں کو ہاتھوں سے چھونے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے ضرور اپنا کوئی خاص منتر پھونکا ہے۔ اشفاق کے پاس بڑے منتر ہیں۔ ہر موقع محل کے لئے اس کے پاس ایک سے زیادہ منتر موجود ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ پردھان منتری ہے۔ میں نے اسے منتر پھونکتے اور پھر اس منتر کا

کامیاب اثر ہوتے دیکھا ہے۔ خالدہ کے معاملے میں اس نے اپنا کوئی ٹھنڈا ٹھنڈا روحانی منتر پھونکا تھا جو کارگر ثابت ہوا اور خالدہ کا ذہن بدل گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک سیدھی سادی شریف لڑکی غلط قسم کے ذہنی انتشار اور جذباتی ہیجان سے نجات پا گئی۔ اس کے بعد خالدہ کافی عرصے تک مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ کوئی دو برس بعد نسرین سے اتفاقاً کسی کالج کے فنکشن میں ملاقات ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ خالدہ نے اپنے ماں باپ کی مرضی سے شادی کر لی ہے اور اب وہ کراچی میں اپنے خاوند کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کی ایک پیاری پیاری بچی بھی ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے یہ خوش خبری اشفاق کو سنائی تو وہ بھی بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"چلو! یہ بھی اچھا ہوا۔ خدا اسے خوش رکھے"

اشفاق احمد کی یہ عادت مجھے شروع ہی سے اچھی لگی تھی۔ اپنی جوانی کے زمانے میں بھی وہ بزرگوں کی طرح ہر کسی کی خیر مانگتا۔ ہر کسی کا بھلا چاہتا۔ لڑائی جھگڑے سے دور رہتا۔ میں نے کئی بار اسے کہا کہ چلو ہیرا منڈی چلتے ہیں۔ صرف سیر کر کے آ جائیں گے۔ مگر وہ کبھی میرے ساتھ وہاں نہ گیا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بھی کبھی ہیرا منڈی نہیں گیا۔ میں بھی ہیرا منڈی مجرا سننے کے لئے نہیں جایا کرتا تھا۔ بس اپنے کسی دوست کے ساتھ سیر کرنے چلا جاتا۔ وہاں کی رونق اور کوٹھوں سے آتی گھنگھروں کی آواز' گانے کی آوازیں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ ریڈیو سٹیشن پر شاہی محلے کی گانے والیوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان کے ساتھ اشفاق بڑے اخلاق سے ملتا۔ اپنی باتوں سے انہیں خوب ہنساتا۔ ان سے شائستگی کی حد تک مذاق بھی کرتا۔ اس سے زیادہ اس کا کسی گانے والی کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔

اشفاق احمد ان دنوں اپنی بھرپور جوانی کے عالم میں تھا۔ وہ اگر چاہتا تو

بیک وقت دو دو رومان چلا سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ ایک تو وہ اندر سے کمزور اور شریف آدمی ہے۔ اور پھر لڑکیوں کے سامنے بڑی جلدی شرما جاتا تھا۔ البتہ میں نے دیکھا ہے کہ وہ اس زمانے میں بھی اپنے سے بڑی کافی بڑی عمر کی خواتین کے ساتھ بڑی جلدی گھل مل جاتا۔ ان کے پاس بیٹھ کر بڑا خوش ہوتا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے اشفاق کو بھی معلوم نہ ہو۔ ریڈیو سٹیشن پر شاہی محلے کی ایک گانے والی آرٹسٹ آیا کرتی تھی۔ میں اس کا نام نہیں لکھوں گا۔ وہ اب زندہ نہیں ہے۔ بڑی خوش گفتار، خوش اخلاق اور دل کی بڑی اچھی عورت تھی۔ وہ اشفاق احمد کو اشفاق جی کہہ کر مخاطب کیا کرتی۔ شکل صورت کی بھی بڑی اچھی تھی۔ عمر میں وہ اشفاق احمد سے چودہ پندرہ برس بڑی تھی۔ اس کا نام میں لیلیٰ رکھ لیتا ہوں۔ لیلیٰ کا گھر شاہی محلے کی ایک چھوٹی سی گلی میں تھا۔ اسے کتابیں رسالے پڑھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ میں شام کے وقت شاہی محلے کی سیر کر رہا تھا کہ اتفاقاً ایک پان والے کی دکان کے سامنے لیلیٰ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے شاہی محلے میں دیکھ کر بڑی خوش ہوئی۔ ظاہر ہے اسے خوش ہونا ہی تھا۔ کہنے لگی۔

"یہاں تک آ گئے ہو تو اب میرا گھر بھی چل کر دیکھ لو"

میں اس کے ساتھ اس کے گھر آ گیا۔ تنگ سی گلی میں مکان تھا۔ مگر اس نے ڈرائنگ روم بڑا سجا رکھا تھا۔ شیلف میں اردو کی کتابیں لگی تھیں۔ ان میں نقوش کے رسالے بھی تھے۔ کہنے لگی۔

"اشفاق جی کا افسانہ جس رسالے میں چھپتا ہے میں اسے خرید کر جلد کراتی ہوں اور سنبھال کر رکھ لیتی ہوں"

میں نے دل میں سوچا کہ یہ بھی ماری گئی۔ مگر فوراً مجھے خیال آ گیا کہ میں جس علاقے میں موجود ہوں اس علاقے کی عورتیں یونہی نہیں مرا کرتیں۔ میں نے لیلیٰ سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم اشفاق جی سے محبت کرنے لگی ہو"

لیلیٰ ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔

"یہ کھیل تم لوگوں کے ہیں۔ ہم کوئی اور کھیل کھیلتی ہیں۔ اچھا جاؤ۔ تمہارے لئے کیا منگواؤں؟ چائے یا شراب؟"

میں نے کہا۔

"پہلے چائے منگواؤ۔ پھر شراب"

وہ بڑی خوش خوش الماری کی طرف بڑھی۔

"شراب تو تھوڑی بہت یہاں ضرور پڑی ہوئی ہو گی"

اس نے الماری کھولی۔ اوپر نیچے ہاتھ مارے اور پھر ایک بوتل نکالی جس میں کچھ شراب باقی بچی ہوئی پڑی تھی۔ بوتل میز پر میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

"اس میں سے مجھے صرف دو پیگ دے دینا۔ باقی تم پی لینا۔ پانی سے پیو گے یا سوڈا واٹر منگواؤں؟ میں تو کوکا کولا ڈال کر پیتی ہوں۔ اس کا کڑوا کڑوا ذائقہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا"

یہ عورت جس کا فرضی نام میں نے لیلیٰ رکھا ہے ویسے بھی بڑی صاف گو اور صاف دل کی عورت تھی۔ کبھی منافقت نہیں کرتی تھی۔ جو دل میں ہوتا صاف کہہ دیتی۔ مگر ایک پیگ پینے کے بعد اس کا دل بہت زیادہ کشادہ ہو گیا۔ جو بات اس کے دل میں شاید کبھی نہ آئی ہو اس نے وہ بھی کہہ دی۔ میں نے جان بوجھ کر اشفاق کی باتیں شروع کر دیں۔ لیلیٰ کا اردو کا علم بھی واجبی سا تھا۔ وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر کتابوں کی شیلف کے پاس گئی اور وہاں سے نقوش کا کوئی نمبر نکال کر لے آئی۔ اس میں اشفاق احمد کا کوئی افسانہ چھپا ہوا تھا۔ وہ صفحہ نکالا اور اشفاق کا افسانہ اونچی آواز میں پڑھنے لگی۔ وہ بڑے جوش میں آ گئی تھی۔ ایک پیرا گراف ہی پڑھ سکی۔ رسالہ بند کر کے میز پر رکھ دیا اور دوسرے پیگ کا گھونٹ بھر کر سرہلاتے ہوئے بولی۔

"تم کو کیا معلوم۔ شاہ جی بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ اتنی سی عمر

میں ہی انہیں بہت کچھ مل گیا ہے"

میں نے پوچھا۔ "کون شاہ جی؟"

لیلیٰ نے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

"اپنے تلقین شاہ جی۔ اشفاق جی"

میں نے فوراً لیلیٰ کی طرف سے توجہ ہٹا کر اپنی توجہ بوتل پر مرکوز کر دی جس میں بڑی تھوڑی شراب رہ گئی تھی۔ میں نے لیلیٰ کو صاف صاف کہہ دیا۔

"تم اپنے دو پیگ پی چکی ہو۔ اب باقی میری ہے"

لیلیٰ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہنے لگی۔

"فکر کیوں کرتے ہو۔ یہاں جو چاہو گے جس وقت چاہو گے ملے گا۔"

پھر وہ صوفے پر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور بڑی حسرت کے ساتھ بولی۔

"تم شاہ جی کے، میرا مطلب ہے اشفاق جی کے دوست ہو۔ کبھی اسے میرے گھر لاؤ۔ تم بتیس راتوں میں سے جو کہو گے میں پورا کر دوں گی۔ بس تم مجھے اس کی مریدنی بنا دو۔ میں تمہیں چاندی کا کڑا پہناؤں گی۔ ساری برادری کی دعوت کروں گی"

وہ نہ جانے کیا کیا کچھ بولتی رہی۔ مجھے اس کی صرف آواز ہی آ رہی تھی۔ پھر آواز بھی آنی تقریباً بند ہو گئی اور میں وہاں سے نکل آیا۔

میں نے اگلے روز اشفاق احمد کو مبارک باد دی اور بتایا کہ لیلیٰ اس کی مریدنی ہو گئی ہے۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" وہ بولا

جب میں نے اسے گزشتہ رات کا پورا قصہ سنایا تو مجھے ہدایتیں دینے لگا۔ "یہ بری عادتیں ہیں۔ انہیں چھوڑ دو۔ وہاں مت جایا کرو۔ میں ان لوگوں کو برا نہیں کہتا۔ مگر تم وہاں جاؤ گے تو یہ تمہاری برائی ہو گی۔"

میں مسکراتے ہوئے اشفاق کی ہدایتیں سنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہو گیا تو میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"ویسے لیلیٰ تم پر مرتی ہے۔ ایک بار میرے ساتھ صرف ایک بار اس کے گھر چلے چلو۔ تمہیں لکھنے کو بہت کچھ ملے گا۔ میں تو رومان پرست بندہ ہوں۔ میرا یہ موضوع نہیں ہے۔"

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اشفاق لیلیٰ سے کترانے لگا۔ پہلے وہ اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کر لیا کرتا تھا۔ اب وہ بے حد محتاط ہو گیا۔ دور سے لیلیٰ سے سلام دعا لیتا اور ادھر ادھر ہو جاتا۔ لیلیٰ بھی عجیب عورت نکلی۔ دو روز بعد جب وہ پروگرام کرنے ریڈیو سٹیشن آئی تو وہ اس رات کی اکثر باتیں بھول چکی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ اشفاق احمد اسے اپنی مریدنی بنانے پر راضی ہو گیا ہے تو وہ حیران سی ہو کر بولی۔

"وہ کیوں؟"

میں ٹھٹھک سا گیا۔

"بھئی! تم نے خود ہی تو اس رات کہا تھا کہ مجھے شاہ جی کی مریدنی بنا دو۔ تمہیں چاندی کا کڑا پہناؤں گی"

وہ اور زیادہ حیران ہوئی۔ کہنے لگی۔

"میں نے کب کہا تھا؟ کہاں کہا تھا؟"

میں بڑا خوش ہوا۔ اس عورت کو اسی قسم کے ردعمل کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ اشفاق احمد اردو کا پروفیسر ہو کر اٹلی شادی سے پہلے گیا تھا یا بعد میں گیا تھا بہرحال وہ اٹلی چلا گیا۔ کچھ عرصہ وہاں کی یونیورسٹی میں اردو پڑھاتا رہا۔ اپنی مدت پوری کرنے کے بعد وہ پاکستان واپس آ گیا۔ وہاں اس کی ایک اطالوی دانشور پروفیسر بوسانی سے بڑی دوستی ہو گئی۔ گزشتہ برس اس پروفیسر کا اطالیہ میں انتقال ہو گیا۔ اشفاق نے اطالوی زبان

بھی سیکھ لی تھی۔ پاکستان آ کر اس نے اٹلی کے بارے میں اپنا افسانہ "رومتہ الکبریٰ" لکھا جو بڑا خوبصورت افسانہ ہے۔

بانو قدسیہ سے شادی کے بعد اشفاق سمن آباد میں آ کر رہنے لگا۔ پہلے پہل وہ شیشوں والی کوٹھی میں رہتا تھا جو میرے گھر کے ساتھ والی کوٹھی ہے اور اب نئی بن گئی ہے۔ اس کے بعد وہ مسجد خضرا والی گراؤنڈ کے سامنے چھوٹی سی کوٹھی میں آ گیا۔ یہاں میں اس سے ملنے اکثر جاتا رہتا۔ یہیں پہلی بار میری ملاقات بانو قدسیہ کے بھائی آرٹسٹ پرویز بٹ سے ہوئی جو بڑا اچھا آرٹسٹ اور اس سے بھی اچھا انسان تھا۔ ہنس مکھ، ہردل عزیز اور دل نواز ـــــ میں ان دنوں فلیمنگ روڈ پر رہتا تھا۔ ایک روز اشفاق میرے گھر آیا۔ اس نے بتایا کہ اس کا ارادہ ایک منفرد قسم کا رسالہ نکالنے کا ہے۔

"یہ اپنی قسم کا انوکھا اور دلچسپ رسالہ ہو گا میرے دماغ میں اس کے لئے بڑے عجیب عجیب منصوبے ہیں۔ تم پرچہ دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔"

اس نے مال روڈ پر جہاں "آفاق" اخبار کا دفتر تھا ایک چھوٹی سی شاہ نشین کرائے پر لے لی۔ رسالے کا نام اس نے "داستان گو" رکھا۔ آفاق والی بلڈنگ کے کچھ حصے ابھی تک جلے ہوئے تھے۔ فسادات کے دنوں میں اس عمارت کو آگ لگا دی گئی تھی۔ "داستان گو" کا دفتر دوسری منزل پر سیڑھیاں چڑھ کر بائیں ہاتھ آتا تھا۔ چھوٹا سا لمبوترا کمرہ تھا۔ پہلو میں ایک سٹور روم تھا۔ پرویز نے بڑے آرٹسٹک انداز میں اس کی آرائش کی۔ اشفاق ایک کاؤنٹر نما میز کے پیچھے بیٹھا ہوتا۔ ہم دوست احباب ٹی ہاؤس سے نکل کر وہاں آ جاتے۔ خوب باتیں ہوتیں۔ شعروشاعری پر باتیں ہوتیں۔ ریڈیو آرٹسٹ محمد حسین اور آفتاب احمد بھی وہاں اکثر آتے۔ میں ان دنوں "آفاق" اخبار کے ساتھ منسلک ہو گیا تھا۔ چنانچہ "داستان گو" میں میری اشفاق سے روز ہی ملاقات ہوتی۔ "داستان گو" رسالہ پاکٹ سائز کا تھا اور اس میں کھچڑی کی

ہوتی تھی۔ اس کی لکھائی چھپائی بڑی معیاری تھی۔ تزئین و آرائش کی ذمے داری پرویز کے سپرد تھی جس نے رسالے کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔ سرورق بڑے کمال کے ہوتے تھے اشفاق نے اس میں "حیرت کدہ" کے نام سے آسیبی واقعات کا ایک سلسلہ شروع کیا جو لوگوں میں بڑا مقبول ہوا۔ اس میں بعض واقعات تو ایسے تھے کہ لوگوں کو اب تک یاد ہیں۔ ان میں کچھ فرضی قصے بھی ہوتے اور سچے واقعات بھی۔ پاک ٹی ہاؤس سے اٹھ کر اکثر ادیب شاعر یہاں آ کر محفل لگاتے۔ چائے کے دور چلتے۔ یہ زمانہ بھی اشفاق کے ساتھ میری دوستی کا روشن اور یادگار زمانہ تھا۔

سعادت حسن منٹو سامنے مال روڈ کے پار لکشمی مینشن میں رہائش پذیر تھے۔ وہ بھی کبھی کبھی "داستان گو" کے دفتر میں آ جاتے۔ محفل کی رونق میں اضافہ ہو جاتا۔ منٹو صاحب اشفاق احمد سے بڑا پیار کرتے۔ منٹو صاحب کا یہ وہ زمانہ تھا جب وہ تقریباً روز ایک افسانہ لکھتے اور کسی اخبار یا رسالے کے دفتر میں جا کر اس کے عوض بیس پچیس روپے وصول کرتے اور تانگے میں بیٹھ کر ے خانے کی طرف روانہ ہو جاتے۔ دوسرے اخباروں کی طرح روزنامہ "آفاق" بھی اپنا ہفتہ وار ادبی ایڈیشن نکالتا تھا۔ اس کے لئے بھی منٹو صاحب کبھی کوئی افسانہ لکھ کر لے آتے۔ واپسی پر وہ دوسری منزل میں "داستان گو" کے دفتر میں آ کر تھوڑی دیر ضرور بیٹھتے۔ کبھی میں اور اشفاق احمد "داستان گو" کے دفتر سے اٹھ کر منٹو صاحب کے ہاں چلے جاتے۔ ایک روز ہم گئے تو منٹو صاحب ڈرائنگ روم میں صوفے کے کونے میں پاؤں اوپر اٹھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے والے صوفے پر ایک دبلی پتلی کالے رنگ کی عورت بیٹھی تھی جس نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ منٹو صاحب موڈ میں تھے اور اس عورت سے کھل کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ عورت شرما بھی رہی تھی اور منٹو صاحب کی باتوں کا مزا بھی لے رہی تھی۔ منٹو صاحب نے اشفاق کی طرف دیکھا اور عورت سے کہا۔

"چلو اچھا ہوا اشفاق احمد بھی آ گیا ہے۔ اس سے پوچھ لو۔"

ہم دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے۔ اشفاق احمد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی خاص بات ہے منٹو صاحب؟"

منٹو نے موٹے شیشوں والی عینک کے اوپر سے اشفاق کو اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور کہا۔

"خاص بات کیا ہوتی ہے خواجہ؟"

پھر منٹو صاحب نے عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میں نے اس سے شرط لگائی ہے کہ میں تمہارے بریزیئر کا سائز زبانی بتا سکتا ہوں۔ یہ مانتی ہی نہیں۔ کیوں خواجہ تم بتاؤ۔ کیا میں ٹھیک نہیں کہہ رہا؟"

اب اشفاق احمد کے شرمانے کی باری تھی۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ منٹو صاحب نے کڑک دار آواز میں کہا۔

"بتا خواجہ؟"

اشفاق نے فوراً کہہ دیا۔

"شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں"

"اوئے شاید کیا ہوتا ہے؟"

پھر منٹو صاحب نے دونوں ہاتھوں کو اس طرح اوپر کیا جیسے کسی شے کا سائز بتا رہے ہوں۔ ہاتھوں کو عورت کی طرف کر کے صوفے سے اٹھے۔ عورت کے قریب گئے تو وہ عورت سمٹ کر گچھا مچھا ہو گئی۔ اس کے بعد منٹو صاحب اپنے خاص انداز میں ہنسنے لگے۔ ان کی ہنسی کی آواز نہیں آیا کرتی تھی۔

ایک روز میں اشفاق کے پاس اس کے "داستان گو" والے دفتر میں آیا تو وہ سر جھکائے میز پر بیٹھا کام کر رہا تھا اس روز موسم سرد تھا اور رات کو ہلکی

بارش بھی ہوئی تھی مال روڈ پر پیپل کے درخت رات کی بارش میں دھلے ہوئے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ مال روڈ خالی خالی سی تھی۔ "داستان گو" کے دفتر میں بھی سردی تھی۔ اشفاق نے چھوٹا سا بجلی کا ہیٹر جلایا ہوا تھا مگر اس کی گرمائش صرف میز تک ہی محدود تھی۔ اشفاق نے ایک نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔

"آ جاؤ۔ ہیٹر کے پاس بیٹھ جاؤ"

وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں بڑے رومانٹک موڈ میں تھا اور لارنس باغ کے درختوں کے پاس جانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"یار، کام پھر کر لینا۔ چلو لارنس باغ چلتے ہیں۔"

اشفاق نے قلم رکھ دی اور مجھے گھورنے لگا۔

"یار کہتے تم ٹھیک ہو۔ چلو لارنس باغ چلتے ہیں۔"

○

ہم "داستان گو" کے دفتر سے اتر کر مال پر آ گئے اور فٹ پاتھ پر چپل کے درختوں کے نیچے سے ہوتے ہوئے لارنس باغ کی طرف روانہ ہو گئے۔

رات کی بارش کی وجہ سے فٹ پاتھ گیلا گیلا تھا۔ اشفاق نے اپنی مخصوص اطالوی گرم جیکٹ پہن رکھی تھی۔ میرے ساتھ چلتا وہ کوئی ہسپانوی اداکار لگ رہا تھا۔ فٹ پاتھ خالی خالی تھا۔ کبھی کبھی کوئی آدمی سامنے سے آکر ہمارے قریب سے ہوتا گزر جاتا۔ مال پر بھی ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہمارے اوپر درختوں کی دھلی دھلائی ٹہنیاں لٹک رہی تھیں۔ ہوا میں نمی اور ٹھنڈک تھی۔ ہم پتلون کی جیبوں میں ہاتھ دیئے چلے جا رہے تھے۔ اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم کیا باتیں کر رہے تھے۔ ضرور موسم درختوں اور انسانوں کے بارے میں باتیں کر رہے ہوں گے۔ کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ جب ہم چڑیا گھر والے دروازے سے لارنس باغ میں داخل ہوئے تو اشفاق نے بائیں جانب گورنمنٹ کالج کے بوٹینیکل گارڈن کے درختوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"یار! یہاں کمال کے درخت لگے ہیں۔ ہر ملک کے درخت دیکھنے کو مل جاتے ہیں"

ابھی چڑیا گھر والوں نے یہ راستہ بند نہیں کیا تھا۔ ہم اس بہت بڑے درخت کے قریب سے گزرے جس کی گنجان شاخوں میں چمگادڑ الٹے لٹکے ہوتے ہیں۔

میں نے اشفاق سے کہا۔

"ہم اوپن ایئر کیفے میں چائے پئیں گے"

وہ کہنے لگا۔

"اس سردی میں اوپن ایئر میں بیٹھ کر چائے پیو گے تو نمونیا ہو جائے گا تمہیں ——"

میں نے کہا۔

"ہم بلیئرڈ روم کے برآمدے میں بیٹھ کر چائے پئیں گے۔"

اس وقت تک اوپن ایئر کیفے والوں نے ایک جانب اونچے اونچے درختوں کے سائے میں لکڑی کا ایک لمبوترا کاٹج بنا لیا تھا جس کے اندر بلیئرڈ ٹیبل لگے تھے۔ شام کو لوگ یہاں آکر بلیئرڈ کھیلا کرتے تھے۔ کاٹج کے آگے لکڑی کے فرش والا ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا جس پر چھت پڑی تھی۔ میں اور انور جلال شمزا بھی اس جگہ آکر بیٹھا کرتے تھے۔

یہ جگہ لارنس باغ کی سب سے رومانٹک جگہ ہے اور مجھے شروع ہی سے بڑی پسند تھی۔ ہم پہاڑی کے دامن میں آکر چھوٹی سی کچی پگ ڈنڈی پر ہو گئے۔ یہ پگ ڈنڈی مجھے ہمیشہ لنکا اور برما کے جنگلوں کی یاد دلاتی ہے۔ پگ ڈنڈی کے دونوں جانب اونچے اونچے گھنے درخت ہیں۔ ان درختوں نے پگ ڈنڈی کو اپنے سائے میں لے رکھا ہے۔ یہاں دونوں جانب انار امرود اور آڑو کے درخت ہیں۔ جہاں سے یہ پگ ڈنڈی شروع ہوتی ہے وہاں کسی زمانے میں ساتھ ساتھ اُگے ہوئے الیچی کے تین درخت ہوا کرتے تھے۔ اب معلوم نہیں وہ درخت یہاں ہیں یا نہیں۔ مجھے بھی باغ جناح گئے مدت ہو گئی ہے۔ ان درختوں کی مالی بڑی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ جب پھل دینے کا موسم آتا تو ان درختوں کی شاخیں الیچی کے گچھوں سے جھکی ہوئی ہوتی تھیں اور ایک مالی قریب ہی بیٹھا ان کی نگرانی کر رہا ہوتا تھا۔ میں نے اشفاق کو وہ درخت دکھائے۔ دسمبر جنوری کا زمانہ تھا۔ درختوں پر پھل نہیں لگا ہوا تھا۔ اشفاق وہاں رک گیا۔ درختوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"تمہیں معلوم ہے ان درختوں کو کھاد کے طور پر بکرے کا خون بھی دیا کرتے ہیں۔ ہمارے قصبے کے باہر ایک باغ میں الیچی کے درخت ہوا کرتے تھے۔ ہم رات کو باغ میں چوری چھپے جا کر الیچیاں توڑ کر لاتے تھے"

ہم دسمبر جنوری کی سردی میں پگ ڈنڈی پر سے گزرتے ہوئے بائیں

جانب اوپن ایئر کیفے کے بلیرڈ روم والے برآمدے میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں سے باغ کا منظر بڑا دلکش نظر آ رہا تھا۔ سارا منظر سینما سکوپ کی طرح لگ رہا تھا۔ برآمدے میں بید کی کرسیوں پر بیٹھے ہم باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں بیرا آ گیا۔ ہم نے چائے کے لئے کہا میں نے اٹلی کی باتیں شروع کر دیں۔ اشفاق اطالیہ کی یادوں میں گم ہو گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"وہاں تمہیں بوسانی کے علاوہ بھی کسی ایسی شخصیت سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو تمہیں یاد رہ گئی ہو۔"

اشفاق خاموش تھا۔ جیسے وہ ماضی کے دھندلے ایوانوں میں کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ بیرا چائے لگا کر چلا گیا۔ میں چائے بنانے لگا۔ چائے کا ایک گھونٹ پینے کے بعد اشفاق نے گہرا سانس لیا اور کہنے لگا۔

"یار! وہاں ایک عورت مجھے ملی تھی۔ کاش! تم بھی اسے ملے ہوتے۔ وہ ہماری یونیورسٹی میں پروفیسر تھی۔ اس کا نام ماریا تھا۔ عام شکل صورت کی عورت تھی۔ عمر تیس بتیس کے قریب ہو گی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ بڑی خاموش خاموش رہتی تھی۔ کسی سے زیادہ گفتگو نہیں کرتی تھی۔ اطالوی عورتیں اور مرد بڑے باتونی ہوتے ہیں۔ بے تکان باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ مگر ماریا ان کے بالکل برعکس تھی۔ بہت کم بولتی تھی۔ چہرے پر ہر وقت ایک اداسی سی جھلکتی تھی۔ مجھے اس عورت کی متانت اور سنجیدگی بڑی اچھی لگی۔ کیفے ٹیریا میں یا یونیورسٹی کی روش پر کبھی کبھی اس سے ملاقات ہوتی تو ہم ایک دوسرے کو ہیلو ہیلو کر لیتے۔ پھر ایسا ہوا کہ ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ ایک بار میں اس کے مکان پر بھی گیا۔ وہ اپنی ماما کے ساتھ رہتی تھی۔ دونوں عورتوں نے شہر کے ایک متوسط سے علاقے میں چھوٹا سا فلیٹ لے رکھا تھا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ ماریا تم نے شادی کیوں نہیں کی؟ ماریا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے البم میں سے تصویریں دکھا رہی تھی۔ اس نے البم بند کر کے ایک طرف رکھ دیا اور دھیمی آواز میں کہا۔ شادی کرنے کو

دل نہیں مانتا۔ وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی ہوئی تھی ورنہ میں اس سے اس قسم کا ذاتی سوال کبھی نہ کرتا۔ میں نے کہا۔ تمہارا کوئی بوائے فرینڈ بھی نہیں ہے۔ کیا بات ہے؟ ہمارے ہاں تو تمہاری عمر کی عورتوں کے بچوں کی بھی شادیاں ہو چکی ہوتی ہیں۔ ماریا نے اس روز مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ دو تین دن گزر گئے۔ ایک روز شام کے وقت ہم دونوں روم کے ایک قدیم اور بڑے پرسکون ریستوران میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ ماریا کہنے لگی۔ پروفیسر! تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں نے شادی اس لئے نہیں کی کہ جس سے مجھے شادی کرنی تھی وہ تمہارے ملک میں واپس جا چکا ہے تم پنجاب میں رہتے ہو ناں؟ وہ بھی پنجابی تھا۔ اس کا پورا نام صاحب داد تھا۔ میں اسے صاحب کہا کرتی تھی۔ پھر ماریا نے مجھے لکڑی کی ایک صندوقچی میں سے ایک تصویر نکال کر دکھائی یہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر ایک فوجی جوان کی تھی جس کے کاندھے پر صوبیدار میجر کی پٹی اور کراؤن لگا ہوا تھا۔ یہ انگریز کے زمانے کی پنجاب رجمنٹ کا صوبیدار میجر تھا۔ میں نے ماریا سے کہا۔ یہ تو فوجی جوان ہے۔ تمہیں کہاں ملا تھا؟ ماریا اپنی یادوں میں گم تھی۔ سانس لے کر بولی۔ صاحب داد سے میری پہلی ملاقات فوجی قیدی کیمپ میں ہوئی تھی۔ وہ جنگی قیدی بن کر کیمپ میں اپنی رجمنٹ کے ساتھ ہی آیا تھا یہ قیدی کیمپ ہمارے پہاڑی گاؤں کے قریب ہی تھا۔ میں روزانہ چشمے پر کپڑے دھونے اور پانی بھرنے جایا کرتی تھی۔ وہ چپ ہو گئی۔ پھر صاحب داد کی تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ یہ تصویر صاحب داد نے مجھے خود دی تھی۔ افسوس! میں اس پر صاحب داد کے دستخط نہ لے سکی۔ اس نے کہا تھا میں نے یہ تصویر قاہرہ میں اتروائی تھی ......"

اشفاق احمد نے اطالوی لڑکی ماریا کی جو ناکام داستان محبت سنائی وہ میں آپ کو اپنی زبان میں سناتا ہوں۔ ہوا یوں کہ دوسری جنگ عظیم میں شمالی افریقہ کے محاذ پر انگریزوں کی انڈین فوج جرمنوں کے گھیرے میں آ گئی۔

جرمنوں نے انہیں قیدی بنا کر اٹلی کے ایک بڑے وسیع و عریض جنگی کیمپ میں منتقل کر دیا۔ ان قیدیوں میں انگریزی فوج کی کسی پنجاب رجمنٹ کے جوان بھی تھے۔ ان میں صوبیدار میجر صاحب داد بھی تھا۔ یہ جنگی قیدی کیمپ ماریا کے گاؤں کے قریب ہی تھا۔ ماریا جہاں چشمے پر کپڑے دھونے جایا کرتی تھی وہاں سے کیمپ کی خاردار تاروں والی دیوار قریب ہی سے گزرتی تھی۔ وہ کپڑے دھوتے ہوئے اکثر قیدی فوجیوں کو کیمپ کی گراؤنڈ میں مشقت کرتے، زمین کھودتے، باغ بوٹے لگاتے دیکھا کرتی۔ کسی قیدی کو خاردار باڑ کے قریب آنے کی اجازت نہیں تھی۔

ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ ماریا چشمے کے پتھر پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ کیمپ کے گراؤنڈ میں قیدی فوجی فٹ بال کھیل رہے تھے۔ جرمن سپاہی دور کھڑے ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ اچانک کسی نے فٹ بال کو کک لگائی تو بال خاردار تاروں والی دیوار کے پاس آ کر رک گیا۔ ایک فوجی قیدی دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے بال اٹھایا اور ماریا کی طرف دیکھا۔ ماریا کہتی ہے کہ میں نے بھی اس قیدی کو دیکھا۔ وہ ماریا کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور فٹ بال اٹھا کر دوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔

اب ایسا ہوتا کہ کسی نہ کسی بہانے وہ فوجی قیدی کانٹوں والی دیوار کے پاس آتا۔ ماریا کو ایک نظر دیکھتا۔ مسکرا کر ہاتھ سے سلام کرتا اور تیزی سے واپس چلا جاتا۔ ماریا کو وہ فوجی جوان بڑا اچھا لگا۔ پہلے پہل تو ماریا بڑی محتاط رہی۔ پھر وہ بھی قیدی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی۔ ایک دن اس نے ہاتھ اٹھا کر قیدی کے سلام کا جواب بھی دیا۔ بس یہاں سے دونوں میں محبت ہو گئی۔

ایک دن اس قیدی نے جان بوجھ کر فٹ بال کو اس جانب کک لگائی جدھر ماریا ذرا نیچے چشمے پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ قیدی فٹ بال کے پیچھے دوڑتا ہوا آیا۔ جب وہ بال اٹھانے لگا تو اس نے کاغذ کی ایک گولی ماریا کی طرف پھینکی جو اس سے تھوڑی دور پتھروں میں آ کر گری۔ قیدی مسکراتا ہوا واپس

بھاگ گیا۔ کیونکہ جرمن سپاہی کسی بھی قیدی کو خاردار تاروں کے پاس نہیں جانے دیتے تھے۔ ماریا نے جلدی سے گیلے ہاتھ پونچھے اور اٹھ کر کاغذ کی گولی اٹھائی۔ ماریا نے باقاعدہ کالج میں تعلیم حاصل کی ہوئی تھی اور انگریزی زبان پر اسے عبور حاصل تھا۔ جنگ کی وجہ سے وہ شہر چھوڑ کر اپنی ماں کے پاس گاؤں میں آ گئی تھی جہاں اس کے باپ کی تھوڑی سی زمینداری تھی۔

ماریا نے کاغذ کھول کر دیکھا۔ انگریزی میں صرف اتنا لکھا تھا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ماریا کہتی ہے کہ میں شرما گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے کاغذ کو تہہ کر کے اپنی قمیض کے اندر چھپا لیا۔ اگلے دن قیدی صاحب داد دور دور سے ماریا کو دیکھتا رہا۔ کیونکہ دو جرمن سپاہی خاردار تاروں کے پاس ٹہل رہے تھے۔ اور اس روز قیدی فٹ بال بھی نہیں کھیل رہے تھے۔ تیسرے دن ماریا نے بھی ایک کاغذ پر انگریزی میں "آئی لو یو" لکھ کر اس کی گولی بنائی اور قمیض کے اندر چھپا کر چشمے پر بیٹھی کپڑے دھوتی رہی۔ وہ بار بار کیمپ کی گراؤنڈ کی طرف دیکھتی۔ صاحب داد اسے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سارے کپڑے دھو لئے تھے اب وہ انہیں نچوڑ رہی تھی کہ اچانک اس نے صاحب داد کو دیکھا وہ فٹ بال کے ساتھ اکیلا ہی کھیلتا ہوا گراؤنڈ میں ادھر ادھر اچھل کود رہا تھا۔ پھر اس نے فٹ بال کو کک لگائی اور اس کے پیچھے دوڑتا ہوا خاردار تاروں کے پاس آ گیا۔ اس نے ماریا کو مسکرا کر اشارے سے سلام کیا۔ ماریا نے جلدی سے قمیض کے اندر سے کاغذ کی گولی نکالی اور اس کی طرف اچھال دی۔ صاحب داد نے لپک کر اسے اٹھا لیا اور فٹ بال کو پاؤں سے ٹھوکریں مارتا کیمپ کی بارکوں کی طرف چلا گیا۔

اب ان دونوں کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہفتے میں ایک بار موقع پا کر صاحب داد کاغذ پر انگریزی میں محبت کا پیغام لکھ کر اس کی گولی بنا کر ماریا کی طرف پھینک جاتا اور دوسرے یا تیسرے دن موقع پا کر کسی بہانے جرمن سپاہیوں کی نظر بچا کر خاردار تار کے پاس آتا اور ماریا کا رقعہ اٹھا

کر لے جاتا۔ ان رقعوں میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا اظہار کیا گیا ہوتا۔ ایک دن صاحب داد خط کی گولی پھینک کر گیا تو ماریا نے اسے قمیض میں چھپا لیا۔ پھر پتھروں کے پیچھے جا کر کھولا تو صاحب داد نے اظہار محبت کے بعد اس سے پوچھا تھا کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ مجھے اس کا نقشہ بنا کر بتاؤ۔ کیونکہ میں نے قیدی کیمپ سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

پہلے تو ماریا خط پڑھ کر گھبرائی۔ پھر اس نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے محبوب کی ہر طرح سے مدد کرے گی۔ اگلے خط میں اس نے خط میں اپنے گھر کا پتہ بتانے کی بجائے ایک باڑے کا نقشہ بنا کر صاحب داد کو اس کا رستہ سمجھایا اور کہا کہ فرار ہونے کے بعد وہ باڑے میں آ جائے۔ اس کے بعد وہ اس کی ہر طرح سے حفاظت کرے گی۔ مویشیوں کا یہ باڑا اب ویران ہو گیا ہوا تھا اور بالکل خالی پڑا تھا۔ یہ کیمپ سے شمال کی جانب دریا پار ایک ٹوٹی ہوئی بارہ دری کے عقب میں واقع تھا۔

دو دن بعد صاحب داد نے خط پھینکا جس میں ماریا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ وہ بہت جلد اسے اپنے فرار ہونے کی تاریخ اور وقت لکھے گا۔ اس بات کو دو ہفتے گزر گئے۔ اس دوران صاحب داد دور دور سے ماریا کو دیکھ لیتا۔ وہ تاروں کے قریب بالکل نہ آیا۔ دو ہفتوں کے وقفے کے بعد وہ فٹ بال سے کھیلتا نظر آیا۔ ماریا سمجھ گئی کہ آج صاحب داد ضرور خط پھینکے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ایک بار اس نے زور سے فٹ بال کو کک لگائی جو لڑھکتا ہوا تاروں کے پاس اس جگہ آ گیا جہاں دوسری جانب چٹان کی اوٹ میں چشمے پر ماریا کپڑے دھو رہی تھی۔ صاحب داد دوڑتا ہوا بال کے پیچھے آیا۔ جلدی سے رقعہ ماریا کی طرف پھینکا اور فٹ بال کو لڑھکاتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

ماریا نے جلدی سے رقعہ کھول کر پڑھا۔

صاحب داد نے لکھا تھا۔

"میں نے آج رات کیمپ سے فرار ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم نے

جو جگہ بتائی ہے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں کل تمہارا وہاں انتظار کروں گا۔ ضرور آنا۔ پھر ہم دونوں یہاں سے کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے اور وہاں جا کر شادی کر لیں گے۔"

ماریا نے خط پڑھا تو اس کے گال حیا کی لالی سے سرخ ہو گئے۔ وہ رات اس نے سوتے جاگتے بسر کی۔ بار بار خدا سے دعا مانگی کہ صاحب داد زندہ سلامت کیمپ سے نکل جائے۔ جرمن سپاہیوں کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ بڑے سنگ دل ہیں اور ذرا سی بات پر گولی مار دیتے ہیں اور جو قیدی فرار ہو رہا ہوا سے تو وہ بالکل زندہ نہیں چھوڑتے۔ رات گزر گئی۔

اس کے کان کیمپ کے سائرن کی طرف لگے ہوئے تھے اگر کسی قیدی کے فرار ہونے کا پتہ چل جائے تو کیمپ کے سائرن چیخ اٹھتے ہیں۔ مگر کوئی سائرن نہ بجا۔ ماریا یہی سمجھی کہ صاحب داد نے فرار ہونے کا منصوبہ ملتوی کر دیا ہو گا۔ پھر بھی وہ منہ اندھیرے گھر سے نکل کر دریا کی طرف روانہ ہو گئی۔ دریا کا پاٹ وہاں بہت چھوٹا تھا۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ دریا میں جگہ جگہ بڑی بڑی چٹانیں اور پتھر پڑے تھے۔ ماریا نے ان پتھروں پر پاؤں رکھ کر دریا پار کیا۔ دریا کی دوسری جانب کچھ فاصلے پر ایک ٹوٹی ہوئی پرانی بارہ دری تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی وہاں آئی اور پھر نشیب میں اتر گئی۔ اونچے نیچے ٹیلے سحری تاریکی میں چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ماریا اس جگہ سے واقف تھی۔ بہت جلد اس نے دور سے مویشیوں کے ویران باڑے کی ڈھلواں چھت دیکھ لی۔

دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ باڑے کے قریب آ کر وہ رک گئی۔ باڑے کا بڑا دروازہ بند تھا۔ وہ پچھلی طرف آ گئی جہاں ایک کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ یہ کھڑکی بھی بند تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس جا کر اسے اندر کو دھکیل رہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے آ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ یہ صاحب داد تھا۔ ماریا کی جان میں جان آئی۔ دونوں محبت کرنے والے ایک دوسرے سے پہلی

بار مل رہے تھے۔ صاحب داد نے کہا۔

"ابھی تک میرے فرار کا جرمنوں کو علم نہیں ہوا۔ لیکن دن نکلنے کے بعد جب گراؤنڈ میں گنتی ہو گی تو پتہ چل جائے گا پھر جرمن کتے لے کر میری تلاش میں نکلیں گے"

ماریا پریشان ہو گئی۔ مگر جلدی اسے ایک خیال آ گیا۔ اس نے صاحب داد سے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ ہم ابھی یہاں سے نکل جاتے ہیں یہاں سے تھوڑے فاصلے پر آرزو کا قصبہ ہے۔ وہاں سے گھنٹے گھنٹے بعد بسیں میگانو شہر کو جاتی ہیں۔ وہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔ ہم اس کے پاس چلے جائیں گے وہ ہمیں کسی نہ کسی طرح سوئٹزرلینڈ پہنچا دے گی۔"

صاحب داد نے کہا۔

"میرے کپڑے قیدیوں کے ہیں۔ جلدی سے گھر جاؤ اور میرے لئے دوسرے کپڑے لے آؤ"

ماریا الٹے قدموں گھر کی طرف بھاگی اور اپنے باپ کی ایک پرانی پتلون اور لمبا گرم اوورکوٹ لے کر آ گئی۔ گھر میں کچھ خبر نہیں تھی۔ اس کے ماں باپ ابھی تک سو رہے تھے۔ صاحب داد نے باڑے میں ہی جلدی جلدی پتلون پہنی۔ قمیض کو الٹا کر کے اوپر مفلر لپیٹا۔ اور کوٹ پہنا اور ماریا کے ساتھ آرزو قصبے کی طرف چل پڑا۔ آرزو قصبے میں پہنچتے پہنچتے سورج نکل آیا۔ صاحب داد کہنے لگا۔

"یہاں کوئی بس دکھائی نہیں دے رہی گنتی شروع ہونے میں آدھا گھنٹہ رہ گیا ہے"

ماریا نے کہا۔

"ابھی بس آ جائے گی۔ تم فکر نہ کرو"

آرزو قصبے کے پرانے اور بوسیدہ مکانوں پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ گلیاں سنسان تھیں۔ لوگ گھروں میں ابھی بیدار نہیں ہوئے تھے۔ بس سٹینڈ بھی خالی تھا۔ ایک کسان بوڑھی عورت بینچ پر خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی۔

اتنے میں دور سے سڑک پر بس آتی نظر آئی۔ ماریا نے اطالوی سکے صاحب داد کو دیئے اور کہا۔

"انہیں اپنے پاس رکھو۔ ٹکٹ میں لوں گی۔ تم خاموش بیٹھے رہنا۔ کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔ نہ کسی کی بات کا جواب دینا۔ باقی میں سنبھال لوں گی"

بس آ کر رکی تو دونوں بس میں بیٹھ گئے۔ وہاں سے میگانی پہنچے۔ اس وقت دن کے دس بج چکے تھے۔ کیمپ میں قیدی کے فرار کا پتہ چل گیا تھا اور جرمن سپاہی آس پاس کے علاقے میں صاحب داد کی تلاش میں نکل چکے تھے۔ میگانی میں ماریا' صاحب داد کے ساتھ اپنی سہیلی کے گھر ایک ہفتہ رہی۔ یہ کافی بارونق شہر تھا اور قیدی کیمپ سے بہت دور تھا۔ ماریا کی سہیلی نے اپنے ایک قابل اعتماد دوست کے ساتھ مل کر دونوں کو سوئٹزرلینڈ بھجوانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ مگر کارروائی بڑی سست رفتار تھی۔ جنگ کا زور بھی بڑھ گیا تھا۔ لوگوں کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ ایک روز اتحادی طیارے میگانی کے فوجی گیریژن پر بھی بم پھینک گئے۔

صاحب داد زیادہ تر گھر میں ہی چھپا رہتا۔ فوجی گیریژن پر بمباری کے بعد جرمنوں کی دو بٹالین وہاں پہنچ گئیں شہر میں جرمن سپاہی چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔ اطالوی سپاہی بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ ماریا نے صاحب داد کو گھر سے باہر نکلنے سے سختی سے منع کر دیا۔ پہلے وہ ہفتے میں دو ایک بار بازار کا چکر لگا لیا کرتا تھا۔ اب وہ سارا سارا دن ماریا کی سہیلی کے گھر کی اوپر والی چھوٹی سی بیٹھک میں ہی پڑا رہتا۔ اس بیٹھک میں گھر کا پرانا ٹوٹا پھوٹا سامان پڑا تھا۔ ایک دن ماریا کچھ چیزیں خریدنے مارکیٹ گئی ہوئی تھی۔ گھر پر اس کی

سیلی تھی۔ بیٹھک میں صاحب داد بھی موجود تھا۔ اچانک ایک فوجی ٹرک مکان کے سامنے آکر رکا۔ اس کے اندر سے دس بارہ جرمن سپاہی چھلانگیں لگا کر باہر کودے اور ماریا کی سیلی کے مکان کا بند دروازہ توڑ کر اندر گھس گئے۔ اندر جاتے ہی تین فوجی رائفلیں تانے اوپر والی بیٹھک کا زینہ پھلانگتے بیٹھک کا بند دروازہ توڑ کر اندر آگئے۔

سامنے صاحب داد حیران پریشان کھڑا تھا۔ صاحب داد کو اس وقت انہوں نے قابو میں کر لیا۔ اسے گھسیٹتے ہوئے نیچے لے آئے اور ماریا کی سیلی کو بھی پکڑ کر باہر لائے۔ دونوں کو ٹرک میں ڈالا اور ٹرک فوجی گیریژن کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ ساری کارروائی بمشکل پانچ منٹ کے اندر اندر ختم ہو گئی۔ محلے کے لوگ باہر آکر سارا تماشہ دیکھتے رہے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہاں دشمن کا کوئی جاسوس یا بھاگا ہوا قیدی چھپا ہوا تھا۔ ماریا واپس آئی تو اس نے دور سے گھر کے باہر لوگوں کا ہجوم دیکھا تو سمجھ گئی کوئی خطرناک بات ہو گئی وہ دوسری طرف سے ہو کر لوگوں کے درمیان آگئی۔ اس نے ایک ناواقف عورت سے پوچھا کہ یہاں کیا معاملہ ہے۔ اس نے جرمن سپاہیوں کو برا بھلا کہتے ہوئے بتایا کہ کوئی مفرور قیدی تھا جرمن سپاہی اسے اور مکان میں جو عورت رہتی تھی دونوں کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔

ماریا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ ایک لمحے کے لئے اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے اور یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مگر فوراً ہی سنبھل گئی۔ وہیں سے الٹے پاؤں مارکیٹ کی طرف چل پڑی۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ بہت جلد وہ اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ یہاں اس کا کوئی جاننے والا بھی نہیں۔ ایک صاحب داد اور اس کی سیلی تھی۔ دونوں کو جرمن فوج گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ اب ان کا برا حشر ہونے والا تھا۔ ماریا کا نازک جسم خوف کے مارے کانپنے لگا۔ اس کی آنکھوں

میں آنسو آگئے۔ وہ مارکیٹ میں جانے کی بجائے شہر سے باہر آگئی۔ وہ ایک پرانے باغ میں آکر بیٹھ گئی۔ یہاں بیٹھ کر جتنی روئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے خوابوں کے محل ویران ہو گئے تھے۔ اسے بار بار صاحب داد کا خیال آتا۔ جرمن اس کو پکڑ کر واپس کیمپ میں لے گئے ہوں گے۔ اسے اپنی سیلی کا بھی خیال آرہا تھا۔ خدا جانے جرمن اس کا کیا حال کریں گے۔

اس دن ماریا واپس اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئی۔ شام کو وہ اپنے گھر میں تھی۔ اس نے ساری کہانی اپنے بوڑھے ماں باپ کو بیان کر دی۔ باپ نے ماریا کو بہت ڈانٹا کہ تم ہم سب کو یہاں سے نکلواؤ گی۔ جرمنوں کو پتہ چل گیا کہ تم نے قیدی کی مدد کی تھی تو وہ ہمیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ماریا کا باپ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ راتوں رات وہ قصبے والے مکان سے بیوی اور ماریا کو لے کر نکل پڑا اور میلان اپنے چھوٹے بھائی کی زمینداری میں چلا گیا۔

اشفاق احمد کہنے لگا۔

"ماریا نے بتایا کہ اس کے بعد صاحب داد سے اس کی پھر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کے دل میں صاحب داد کی محبت کا نقش اتنا گہرا تھا کہ وہ اسے کبھی نہ بھلا سکی۔"

ہماری باتوں میں آسمان پر بادل چھا گئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے بیرے کو مزید چائے لانے کے لئے کہا۔ اشفاق کہنے لگا۔

"نہیں یار۔ بڑی دیر ہو گئی ہے۔ چلنا چاہیے مجھے ابھی بڑا کام کرنا ہے"

میں نے کہا۔

"ماریا کی کہانی سنانے کے بعد بھی تم کو دنیا داری کا خیال آرہا ہے۔ تم نے اتنی رومانٹک اور اداس کہانی سنائی ہے کہ میں روم کے شہر

میں ماریا کے پاس پہنچ گیا ہوں"
اشفاق ہاتھوں کو رگڑ کر گرم کرتے ہوئے بولا۔

"یار ماریا مجھے بھی بڑی یاد آتی ہے بڑی سنجیدہ مزاج خاتون تھی۔ یورپ کے ماحول میں محبت کی اس قسم کی روایات اب کہاں ملتی ہیں بھلا؟ ماریا بالکل ہمارے ماحول کی خاتون تھی۔ ویسے بھی اٹلی والوں پر مشرقی روایات کا کافی اثر ہے۔"

میں بارش کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے موتی درختوں کی شاخوں پر سے پھسل کر گھاس پر گر رہے تھے۔ سردی زیادہ ہو گئی تھی۔ چائے کا دوسرا دور چلنے لگا۔ چائے ختم ہوئی تو بارش بھی رک گئی۔ اشفاق کندھوں کو جھٹکتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"بس یار۔ اب میں نہیں بیٹھ سکتا۔ اب یہاں سے نکل چلو۔ پیچھے نہ جان کون کون ملنے آیا ہو گا۔"

لارنس باغ والے کچے راستے سے ہماری واپسی بڑی رومانٹک تھی۔ میں تو جیسے سری لنکا کے کسی جنگل میں سے گزر رہا تھا۔ مگر بڑی جلدی میرا جنگل کا خواب ٹوٹ گیا اور میں چڑیا گھر کے سامنے مال روڈ پر آ گیا تھا جہاں ایک تانگہ ٹھکا ٹھک جا رہا تھا۔

مئی کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ لاہور میں کافی گرمی پڑنے لگی تھی۔ لو بھی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں اشفاق احمد کے پاس "داستان گو" والے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ہمارا ایک خوش باش قسم کا دوست آ گیا۔ اس کا نام سکندر تھا۔ آج کل وہ شارجہ میں ایک عرصے سے مقیم ہے اور وہیں کاروبار کرتا ہے۔ سکندر ادب نواز آدمی تھا اور ہروقت سیر سپاٹے کے موڈ میں ہوتا۔ کبھی آتا تو آتے ہی کہتا چلو یار شیزان چلتے ہیں۔ چلو لارنس کی سیر کر آئیں۔ اس روز وہ "داستان گو" کے دفتر میں آیا تو آتے ہی اف اف کرنے لگا۔

"لاہور میں بڑی گرمی پڑ رہی ہے۔ اشفاق صاحب چلیں آپ کو

ایک خوبصورت نہر کی سیر کروا لاؤں۔ خدا کی قسم! پاکستان میں اتنی خوبصورت نہریں ہیں کہ کیا بتاؤں۔"
اشفاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھائی! کام بہت کرنا ہے۔ پرچہ پریس میں جانے والا ہے"
سکندر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اشفاق صاحب پرچے تو پریس میں جاتے ہی رہتے ہیں۔ اس وقت موقع ہے۔ لو بھی چل رہی ہے۔ گرمی بھی پڑ رہی ہے۔ نیچے گاڑی بھی کھڑی ہے۔ شیخوپورہ والی نہر تک ہی جانا ہے۔ ایک گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔"

میں تو تیار ہی تھا خدا جانے اشفاق احمد کیسے تیار ہو گیا کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"چلو بھائی سکندر! ذرا نہر میں بھی نہا آئیں۔ اپنے قصبے کی نہر میں نہائے ایک عرصہ گزر گیا ہے"

ہم نیچے آ کر گاڑی میں بیٹھے۔ سکندر گاڑی نکال کر مال پر لے آیا اور پھر اس کا رخ شیخوپورے کی طرف کر دیا۔ شاہدرہ پہنچے تو شیخوپورے والی سڑک پر ہو گئے۔ شیخوپورے والی سڑک اس زمانے میں بڑی پرسکون سڑک ہوا کرتی تھی۔ چھوٹی سی سڑک تھی۔ دونوں طرف ٹاہلیوں کے درخت کھڑے تھے۔ بڑی ہری بھری سرسبز خوشبودار ٹاہلیاں ہوا کرتی تھیں۔ مئی کے دنوں میں ان پر بور آ جاتا تھا۔ ساری سڑک ان کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔

سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ ابھی یہاں کارخانے نہیں لگے تھے۔ فضا صاف تھی۔ سکندر کافی تیز گاڑی چلا رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہم نہر پر پہنچ گئے۔ سکندر نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی۔ ہم نہر کے کنارے پر چڑھ گئے۔ کنارے سڑک سے اونچے تھے۔ نہر کو دیکھا تو ایک عجیب منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ لبالب بھری ہوئی نہر بڑے سکون کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ دھوپ

میں اس کی سطح شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ پانی کی سطح پر پتے لہروں کے ساتھ تیرتے چلے جا رہے تھے۔ صرف ان پتوں کی وجہ سے محسوس ہو رہا تھا کہ نہر بہہ رہی ہے۔ اشفاق احمد نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ مجھے یاد ہے اس نے نہر کے کنارے پر آتے ہی نہر میں دھڑام سے چھلانگ لگا دی اور دوسرے کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ اس کی شلوار مشک کی طرح پھول گئی۔ مجھے بڑی ہنسی آئی۔ میں نے پتلون قمیض پہنی ہوئی تھی۔ دل تو میرا بھی چاہتا تھا کہ نہر میں نہاؤں۔ کبھی امرتسر کے کمپنی باغ والی نہر میں صبح شام چھلانگیں لگایا کرتا تھا۔ مگر پتلون قمیض کی وجہ سے مجبور تھا۔ مجھے اشفاق پر بڑا رشک آیا اور وہ مجھے اس وقت بڑا اچھا لگا کہ اس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر کپڑوں سمیت نہر میں چھلانگ لگا دی تھی۔

کاش! میں بھی ایسا کر سکتا۔ اشفاق احمد تیرتا تیرتا نہر کے دوسرے کنارے تک گیا۔ وہاں سے اس نے مجھے آواز دی۔

"حمیدا مار دے چھال۔ آ جا توں وی"

میں ہنستا رہا۔ سکندر بھی مسکراتا رہا اور خوش ہوتا رہا۔ ہم دونوں میں سے کسی نے بھی نہر میں چھلانگ نہ لگائی۔ ہمارے کپڑوں نے ہم دونوں کو جکڑے رکھا۔ پروگرام سکندر کا تھا اور اس کا مزا اشفاق لے رہا تھا۔ وہ تیرتا ہوا ہمارے کنارے پر آ کر باہر نکل آیا۔ اس کے سارے کپڑے گیلے ہو کر اس کے جسم سے چمٹ گئے تھے۔ ابھی اشفاق نے داڑھی نہیں رکھی تھی۔ مجھے لکھتے ہوئے خیال آتا ہے کہ اگر اس وقت اس کی داڑھی ہوتی تو وہ اسے ہاتھ سے ضرور جھاڑتا۔ گرمی پڑ رہی تھی۔ لو بھی چل رہی تھی۔ ہم ٹاہلیوں کے نیچے نہر کے کنارے ٹہلتے ٹہلتے دور نکل گئے۔ اشفاق احمد کے کپڑے تھوڑی دیر میں ہی سوکھ گئے۔ اشفاق کہنے لگا:

"تم لوگ بھی نہا لو۔ یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ لاہور سے کہاں باہر نکلنا ہوتا ہے۔"

مگر ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہانے پر راضی نہ ہوا۔ سکندر نے کہا۔

"اشفاق صاحب! میرا کام تو لوگوں کو تیار کر کے میدان میں لانا ہے۔ آگے ان کا اپنا کام شروع ہو جاتا ہے۔ میں وہاں سے واپس چلا جاتا ہوں۔"

نہر کے کنارے ٹاہلیوں کی خوشبو سے مہک رہے تھے۔ ٹاہلیوں پر اب بھی مئی کے مہینے میں بور آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے زرد رنگ کے پھول کھلتے ہیں۔ ان کی خوشبو اڑتی ہے مگر شیخوپورہ روڈ کی طرف سے آنے والی پٹرول کی بو اور اس کا دھواں اس خوشبو کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ تب ایسا نہیں تھا۔ شیخوپورے والی سڑک کی طرف سے بھی ٹاہلیوں کی خوشبوئیں آتی تھیں۔ اس سڑک پر بھی دونوں جانب ٹاہلیوں کے درخت بڑے سرسبز ہوا کرتے تھے۔ اب یہ درخت ڈیزل کے دھوئیں سے کالے پڑ رہے ہیں۔

ہم نے کافی وقت نہر کے پرسکون خوشبودار ماحول میں گزارا اور پھر نہر کو الوداع کہا اور لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔ اشفاق کہنے لگا۔ "مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔"

مجھے یاد آ گیا کہ بچپن میں جب میں نہر میں چھلانگیں لگایا کرتا تھا تو مجھے بھی بعد میں بڑی بھوک لگتی تھی۔

○

امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آنے کے بعد میرا سب سے پہلا ٹھکانہ گوالمنڈی میں بنا تھا۔ امرتسر کے ہمارے سبھی جاننے والوں اور رشتہ داروں نے لاہور کے اسی علاقے میں مکانات الاٹ کروا لئے تھے۔ گوالمنڈی کے چوک والے ریستورانوں میں ہماری محفلیں لگتیں۔ رات گئے تک ہم ان چائے خانوں میں بیٹھے امرتسر کے فسادات اور فسادات میں شہید ہونے والوں کی باتیں کرتے۔ پیچھے اپنے جو گھر چھوڑ آئے تھے۔ جو گلیاں' باغ' بازار چھوڑ آئے تھے ان کی باتیں کرتے۔ ان لاشوں کا ذکر کرتے جو ہم نے سڑکوں' ریلوے لائنوں' گلیوں' بازاروں اور نالیوں پر بے گور و کفن پڑی دیکھی تھیں۔ کبھی ساری ساری رات شعروشاعری اور گانے بجانے میں گذر جاتی۔ گانا بجانا یہی تھا کہ ہمارا ایک درزی ساتھی تھالی بجاتے ہوئے ماہیا یا مرزا صاحباں سناتا۔ نذیر ربانی داغ کی کوئی غزل چھیڑ دیتا۔ اگر ساغر صدیقی کشمیر ہوٹل کی طرف سے پھرتا پھراتا وہاں آ جاتا تو اس سے شعر سنتے۔ ساغر صدیقی ابھی پورے کپڑوں میں ہوتا تھا۔ وہ ابھی سیاہ پوش نہیں ہوا تھا۔ جس نے شراب پینی ہوتی وہ شیخو کے ڈیرے کی طرف چل دیتا۔ جو چرس کا رسیا ہوتا وہ وہیں سگریٹ بنا کر سلگاتا مزے سے گھٹ ہو جاتا۔ ہم میں زیادہ تر چائے کے شوقین تھے۔ رات گئے تک چائے کی پیٹیکیں بھر بھر کر آتی رہتیں ہم سب ایک بہت بڑے طوفان سے گذر کر آئے تھے۔ کسی کو اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ آگے چل کر کیا کرے گا؟ کیا بنے گا؟ سب اسی حال میں مست تھے کہ آپس میں مل بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ اور رات گذر جاتی ہے۔

ایک روز میں نے اشفاق سے کہا۔

"تم حقیقت پرست ہو۔ اور بڑے اچھے اچھے دلچسپ اور زندہ کردار اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہو۔ میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں اپنے گوالمنڈی کے دوستوں سے ملاتا ہوں۔ تم ان سے مل کر خوش ہو گے۔"

چنانچہ ایک شام میں اسے لے کر گوالمنڈی میں آ گیا۔ اس روز میرے دوستوں کی محفل شیراز ہوٹل میں جمی ہوئی تھی۔ میں نے اشفاق کا اپنے دوستوں سے تعارف کرایا۔ ان میں سے بہت سوں نے اشفاق احمد کی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔ وہ اشفاق سے مل کر بڑے خوش ہوئے۔ اس کے لئے ڈبے کی چائے کا آرڈر دیا۔ یہ خاص دودھ پتی والی چائے ہوتی ہے جس کی پیالی میں اوپر ملائی کی تہہ جمائی جاتی ہے۔ شفیع کے ہوٹل سے کھنڈ کچے منگوائے گئے۔ اشفاق کھنڈ کچے غور سے دیکھنے لگا۔

"یہ خطائیاں تو بڑی صحت مند ہیں"

ضیاء بٹ نے ہنس کر کہا۔

"سر جی! یہ خطائیاں نہیں ہیں۔ یہ امرتسری کشمیریوں کی خاص سوغات ہے انہیں کھنڈ کچے کہتے ہیں۔ یہ قہوے کے ساتھ کھائے جاتے ہیں۔ لیکن آپ پٹن چائے کے ساتھ بھی ان کا مزا لے سکتے ہیں۔"

ضیاء بٹ کو ہم جاوا کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ کشمیری شالوں کی کڑھائی یعنی تِلا اور رفوگری کا بہترین کاریگر تھا۔ میں نے اسے اپنے دوست شمو سے بھی ملایا جو گوالمنڈی کے چوک میں گرمیوں میں برف اور سردیوں میں مچھلی بیچتا تھا۔ بعد میں اس نے چوک میں اپنی دکان خرید لی اور سگریٹ کی ایجنسی بھی لے لی۔ شمو ساغر صدیقی کا زبردست مداح تھا اور اس نے اپنی دکان میں ساغر صدیقی کی ایک تصویر شیشے کے فریم میں جڑوا کر لگا رکھی تھی۔ میں نے اشفاق

احمد کو اپنے امرتسری دوست اعظم کے چھوٹے بھائی قاسم سے بھی ملایا۔ قاسم کو بدمعاش بننے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لئے بستہ الف کے ایک نامی گرامی بدمعاش کی شاگردی اختیار کر رکھی تھی۔ قاسم کی عمر ابھی چھوٹی تھی مگر وہ اپنی جیب میں کمانی دار چاقو رکھتا تھا۔ جسے وہ وقت بے وقت جیب سے نکال کر کھولتا۔ اس چاقو کے کھلنے سے آواز پیدا ہوتی تھی۔ قاسم نے اشفاق کے سامنے کمانی دار چاقو کھولا تو اشفاق نے پوچھا۔

"ابھی تمہاری اتنی چھوٹی سی عمر ہے اور تم نے اتنا بڑا چاقو اپنے پاس رکھا ہوا ہے"

قاسم نے اتنے بڑے چاقو سے چھوٹا سا امرود کاٹتے ہوئے کہا۔

"اپنا اپنا شوق ہوتا ہے جی"

گوالمنڈی کے چوک میں ہمارا ایک اور مشترکہ دوست رہا کرتا تھا۔ اس نے جس متروکہ کوٹھڑی میں مکان الاٹ کروایا تھا وہاں آج کل پرنٹنگ پریس لگے ہوئے ہیں۔ اس شاعر دوست کے مکان کی کوئی سیڑھی نہیں تھی۔ مکان دوسری منزل پر تھا نیچے مٹی کا ٹیلا سا بنا ہوا تھا۔ اس کے مکان پر کوئی ملنے والا آتا تو شاعر اوپر سے رسے کی سیڑھی نیچے لٹکا دیتا تھا۔ مہمان جان کا خطرہ مول لے کر رسی کی سیڑھی کے ذریعے کھڑکی میں سے مکان میں داخل ہوتا۔ ہم اس سے ملنے اس کے مکان پر کبھی نہیں گئے تھے۔ سامنے کشمیر ہوٹل میں ہی اس سے گپ شپ کر لیتے تھے۔ ہمارے اس شاعر دوست میں یہ بات بڑی اچھی تھی کہ وہ ہمیشہ دوسروں کے شعر سناتا تھا۔ اپنے شعر صرف تنہائی میں گنگنایا کرتا تھا۔

گوالمنڈی کے شیراز ہوٹل میں ہی میں نے اشفاق کو نوعمر، بے باک مگر گمنام صحافی حسرت سے بھی ملایا۔ اگر میں بھولتا نہیں ہوں تو اس کا نام یا تخلص حسرت ہی تھا۔ دبلا پتلا سوکھا سا کھا نوجوان لڑکا تھا۔ اسے ٹی بی کا مرض ہو

گیا تھا۔ اپنے گاندھی پارک والے گھر پر ہی خبریں بناتا۔ ان کی کاپیاں کرتا اور اس زمانے کے اخباروں کے دفتروں میں جا کر خود ہی دے آتا۔ چیمبرلین والے چوک میں ایک متروکہ بلڈنگ میں اخبار "سفینہ" کا دفتر ہوتا تھا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر وقار انبالوی تھے۔ اشفاق احمد جس روز میرے ساتھ گوالمنڈی میں آتا تو ہم وقار صاحب سے ملاقات کرنے ان کے دفتر بھی جاتے۔

میرے گوالمنڈی کے امرتسری دوستوں میں ایک پیرجی بھی تھا۔ وہ کوئی بزرگ نہیں تھا۔ ہماری عمر کا نوجوان ہی تھا۔ مگر سب اسے پیرجی پیرجی کہتے تھے۔ پیرجی نے کوئی امتحان پاس نہیں کیا تھا۔ مگر وہ جرائم کے بارے میں تمام قانونی نکات کا ماہر تھا۔ کوئی شخص جرم کر کے اس کے پاس آتا تو پیرجی اسے ایسے ایسے نکتے بتاتا کہ مجرم بھی حیران رہ جاتا۔ اور اکثر اوقات ضمانت پر رہا بھی ہو جاتا۔

گوالمنڈی میں ہمارے ایک دوست کی شادی تھی۔ اس نے اشفاق کو بھی دعوت نامہ دیا اور کہا۔

"سرجی! آپ بھی ضرور آئیں۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

اشفاق احمد نے کہا۔

"میں ضرور آؤں گا۔ حمید کے ساتھ ہی آؤں گا"

میں اشفاق کو شادی سے ایک رات پہلے بھی وہاں لے گیا۔ ہمارے دوست نے موسیقی کی محفل سجائی تھی مکان کے صحن میں دریاں بچھی تھیں۔ گاؤ تکیے لگے تھے ہمارے سب دوست بیٹھے ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر مذاق کر رہے تھے۔ کہیں شعر و شاعری پر باتیں ہو رہی تھیں گانے والوں میں نذیر ربابی اور نذیر نیلر ماسٹر پیش پیش تھے۔ ہمارا دوست امرتسری کشمیری تھا۔ اس نے خاص طور پر ساگ مچھی کی دیگ پکوائی تھی۔ پہلے سبز کشمیری چائے کا دور چلا۔ ساتھ باقرخانیاں بھی تھیں۔ دس بجے رات کو دیگ کا منہ کھل گیا اور سب نے مزے لے لے کر سفید چاولوں کے ساتھ ساگ مچھی کھائی۔ پھر

چائے آ گئی۔ چائے کے بعد شمبو کی دکان سے پان کے تھال آ گئے۔ سگریٹ سلگا لئے گئے اور سب سے پہلے نذیر ٹیلر ماسٹر نے گھڑے پر ماہیا سنایا۔ پھر سامعین کی فرمائش پر پنجابی فلموں کے دو گیت سنائے جو اس زمانے میں بڑے مقبول تھے۔ مثلاً

سوہے چوڑے والئے
نی اک واری آ جا
ساہنوں مکھڑا وکھا جا

اس کے بعد نذیر ربابی نے اپنی سُریلی آواز میں اساتذہ کا کلام سنانا شروع کیا۔ نذیر ربابی لے کاری اور سُر کا بادشاہ تھا۔ رات بھر یہ محفل جاری رہی۔ رات کے کوئی تین بجے اشفاق نے میری طرف جھک کر کہا۔

"یار! اب چلنا چاہیے۔ بڑی دیر ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا۔

"اب جا کر کیا کرو گے۔ رات تو گذر ہی گئی ہے۔ صبح ہریسے اور کلچے کا ناشتہ کر کے چلے جانا"

مگر اشفاق احمد نہ رکا۔ میں اسے کسی بہانے محفل سے اٹھا کر باہر بازار میں لے آیا۔ خوش بہار کا موسم تھا۔ پچھلے پہر کی ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ چیمبرلین کے چوک سے ہمیں ایک خالی تانگہ مل گیا۔ اشفاق کو رخصت کر کے میں زندہ دلان امرتسر کی محفل میں واپس آیا تو ضیاء بٹ نے دور سے بلند آواز میں پوچھا۔

"اشفاق صاحب چلے گئے کیا؟"

میں نے کہا۔

"ہاں یار! انہیں صبح جلدی اٹھنا تھا"

نذیر ٹیلر ماسٹر نے کہا۔

"اب اٹھنے کی ضرورت ہی کہاں تھی"

دوسرے دن بارات تھی۔ اشفاق بھی برات میں میرے ساتھ تھا۔ دولہا کی طرف سے کشمیری باجے کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا تھا۔ ابھی لاہور میں امرتسر کے کشمیری بینڈ والے موجود تھے اور کشمیریوں کی برات میں انہیں ضرور بلایا جاتا تھا۔ برات کو گوالمنڈی سے نسبت روڈ تک ہی جانا تھا۔ مگر اس نے بڑے ڈاک خانے کی طرف سے ہو کر ساری میکلوڈ روڈ کا چکر لگایا۔ آگے آگے کشمیری باجا تھا۔ بوسکی کی شلوار قمیضوں میں ملبوس کشمیری نے نواز' قراقلی کی ٹوپیاں پہنے گھنگھاریاں اور شہنائیاں بجاتے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے سوہنی کا روایتی بینڈ تھا۔ لڑکی والے بھی امرتسری کشمیری تھے۔ جب برات لڑکی والوں کی گلی میں داخل ہوئی تو کشمیری بینڈ بج رہا تھا۔ برات پر پیسے لٹائے گئے۔ گلی میں تمبو قناتیں لگی تھیں۔ دوسری طرف دیگیں دم ہو رہی تھیں۔ لڑکی والے اور لڑکے والے سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ کھانا منی نائی نے پکایا تھا۔ وہ بھی امرتسر کا تھا۔ براتی تمبو کے نیچے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میری ایک جانب اشفاق بیٹھا تھا دوسری طرف گوالمنڈی کے مشہور آڑھتی حاجی صاحب بیٹھے تھے۔ منی نائی دیگیں چھوڑ کر دوڑتا ہوا آیا اور حاجی صاحب کی طرف جھک کر بڑی رازداری کے ساتھ بولا۔

"حاجی صیب! بڑا دل دار زردہ پکایا ہے میں نے ——— ذرا چکھ کر جانا"

یہ کہا اور حاجی صاحب کا جواب سنے بغیر جیسے آیا تھا ویسے ہی تیز تیز قدموں سے واپس چلا گیا۔ اشفاق میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ زردہ واقعی اس نے بڑے کمال کا پکایا تھا۔ شام کو دلہن کی ڈولی روانہ ہوئی تو اس پر سے بھی پیسے اور اکنیاں دونیاں لٹائی گئیں۔ جب تک ڈولی نسبت روڈ پر رہی آگے آگے کشمیری باجا ہی بجتا رہا۔ جب برات چوک میں پہنچی تو میں نے اور اشفاق نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا اور پھر سب کی آنکھ بچا کر وہاں سے کھسک گئے۔

گوالمنڈی کے چوک سے شاہ ابوالمعالی کی طرف آئیں تو آگے جا کر ایک گلی بائیں ہاتھ کو مڑتی ہے۔ اس گلی میں میرے ایک باذوق اور خوبصورت باتیں کرنے والے امرتسری دوست کا مکان تھا۔ اس کا نام طفیل تھا۔ طفیل کو ادب اور موسیقی سے زبردست لگاؤ تھا۔ اس نے جب سنا کہ اشفاق احمد شیراز ہوٹل میں میرے ساتھ آتا جاتا ہے تو وہ ایک دن صبح صبح میرے مکان پر آ گیا۔ مکانوں پر ان دنوں گھنٹیاں کہاں ہوتی تھیں۔ گلی میں سے آواز دے کر بلایا کرتے تھے۔ طفیل نے بھی نیچے سے مجھے آواز دی۔ دوسری یا تیسری آواز پر میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ نیچے طفیل نے جگت لگاتے ہوئے کہا:

"مولانا! نیچے آجاؤ۔ بڑی سپر سانک بات کرنی ہے۔"

طفیل کی اپنی ڈکشن تھی۔ وہ اپنی گفتگو میں مفہوم ادا کرتے ہوئے نئی نئی سائنسی ایجادات کے لفظ اور اصطلاحیں بے دریغ استعمال کرتا تھا۔ اب اگر میں اس کے ڈائیلاگ لکھتے وقت کوئی اصطلاح بھول جاؤں تو درگزر کر دیجئے گا۔

میں گلی میں آیا تو طفیل تھوڑی دیر تک گردن پیچھے کے بالکل سیدھا کھڑا میری طرف دیکھ کر مسکراتا رہا پھر بولا۔

"خواجہ صیب! یہ بات ٹھیک نہیں ہے اشفاق احمد صاحب گوالمنڈی میں آئیں اور ہماری ان سے تُو تُو مَیں مَیں نہ ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ اشفاق میرے ساتھ یہاں آتا ہی رہتا ہے اسے لے کر میں تمہارے پاس بھی ضرور آؤں گا۔ طفیل نے قہقہہ لگایا۔

"تو پھر بس کنکشن آج دوپہر کو ہی ہو جانا چاہیے۔ انہیں ایسے دیدہ زیب کریلے گوشت کھلاؤں گا کہ امرتسر کا نقشہ سامنے آجائے گا۔" میں نے کہا۔

"یار پتہ نہیں آج دوپہر کو اس کی کیا مصروفیات ہیں۔ مجھے پہلے اس سے مل کر طے کر لینے دو۔"

طفیل نے ایک ہاتھ اپنے کان کو لگایا اور بلند آواز میں بولا۔

"خواجہ صیب! خدا کو جان دینی ہے بس معاملہ ڈن ہو گیا۔ شو شنک پیک اپ میں ابھی حاجی صاحب سے ونڈو کا گوشت لے جا رہا ہوں"

میں اسے آوازیں ہی دیتا رہ گیا اور طفیل پیچھے دیکھے بغیر ہاتھ سے نفی میں اشارے کرتا آگے نکل گیا۔ میں جلدی جلدی نہا دھو کر سیدھا اشفاق کے گھر پہنچا اور اسے کہا کہ دوپہر کا کھانا گوالمنڈی میں طفیل کے گھر ہے۔ میں نے اشفاق کو راضی کر لیا۔ دوپہر تک میں اس کے ساتھ ہی رہا۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب میں اسے لے کر گوالمنڈی آ گیا۔ گلی میں طفیل کے گھر کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے اسے آواز دی۔ چھجے کی چق اٹھا کر اس نے مجھے اور اشفاق کو دیکھا اور وہیں سے بازو اوپر اٹھا کر بولا۔

"وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے میں نیچے لینڈ کر رہا ہوں۔"

اشفاق احمد سے طفیل بڑی گرمجوشی سے ملا۔ اس کے افسانوں کی اپنی خاص زبان میں تعریفیں کرنے لگا۔

"بڑے بم بانسک افسانے لکھے ہیں آپ نے اشفاق صیب! بس یہ گھر الاٹ کرا لیا ہے۔ اوپر تشریف لائیں"

ہم دوسری منزل کے کمرے میں آ کر پرانے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ طفیل کو موسیقی کا بے پناہ شوق تھا۔ ایک ریکارڈ پلیئر اس نے رکھا ہوا تھا۔ لتا گیتا رائے اور جو تھیکا رائے سہگل اور پنکج ملک کے لانگ پلے ریکارڈ اس نے بڑی تگ و دو کر کے جمع کیے ہوئے تھے۔ اشفاق کی طرف دیکھ کر اس نے کہا۔

"اجازت ہے سر؟"

اور اس نے میوزک ڈائریکٹر سجاد کی بنائی ہوئی دھن میں گیتا رائے کا گایا ہوا ایک ریکارڈ لگا دیا۔

درشن پیاسی آئی داسی
جگ مگ دیپ جلائے
پربھو چرن کی دھول ملے تو
جیون میں سکھ پائے

ریکارڈنگ کے ساتھ گفتگو بھی جاری رہی۔ طفیل نے افسانوی ادب پر جب اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ شروع کیا تو اشفاق بڑا متاثر ہوا۔ پھر تنور کی روٹیاں' کریلے گوشت' دہی اور خربوزے آ گئے۔ اس کے بعد سبز کشمیری چائے کا دور چلا۔ طفیل بڑا خوش تھا۔ اس نے اپنے ایک اور دوست کو بھی مدعو کیا ہوا تھا۔ وہ دوست زیادہ تر خاموش رہا۔ لیکن ہر کسی کی بات پر سر ہلا کر اس کی ہاں میں ہاں ضرور بھرتا۔ اگر اشفاق کوئی بات کر رہا ہوتا تو یہ خاموش دوست اس کی طرف ٹکٹکی باندھے تکتا رہتا اور اس کے چہرے پر الفاظ کے مطابق خاموش تاثرات ابھرتے رہتے۔ جب اشفاق فیصلہ کن انداز میں کسی بات کی تصدیق یا نفی کرتا تو خاموش دوست فوراً یوں سر ہلا دیتا جیسے کہہ رہا ہو۔ بات ہوئی نا۔ آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ طفیل نے ایک بار اس کی طرف اشارہ کر کے اشفاق سے کہا کہ میں اسے خاموش فلموں میں سے نکال کر لایا ہوں۔ جب ہم رخصت ہونے لگے تو طفیل نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اشفاق کے ساتھ بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور اس کا بار بار شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔

"اشفاق صاحب! بقول سعادت حسن منٹو یہ بڑی ٹیپ ٹولہ دعوت تھی۔"

ہم گوالمنڈی کی گلیوں میں سے گذرتے میکلوڈ روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ اشفاق کہنے لگا۔

"یار! کیسے کیسے نادر زمانہ لوگ ان گلیوں میں رہتے ہیں۔"

میرا فلمی دنیا کے ساتھ بھی ایک سلسلہ بن گیا تھا۔ اس عہد کے نامور اور کامیاب فلم ڈائریکٹر اور پروڈیوسر انور کمال پاشا نے مجھے اپنے یونٹ میں لے لیا تھا۔ وہاں میرے بڑے بڑے دوست بن گئے تھے۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی لوگ مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے۔ ان میں میرے ہم عمر بھی تھے اور مجھ سے بڑی عمر کے بزرگ بھی شامل تھے۔ میری اکثر راتیں فلمی ماحول میں کسی سٹوڈیو میں سیٹ پر گذرتیں میں باقاعدہ کوئی فلم تو نہیں لکھ رہا تھا لیکن پاشا صاحب کے لئے کسی نہ کسی سکرپٹ پر کام ضرور کرتا رہتا تھا۔ فلم کے لئے لکھنے کا میرے دل میں کوئی زیادہ شوق بھی نہیں تھا۔ میری ساری توجہ محبتیں کرنے اور ان محبتوں کے بارے میں افسانے ناول اور ناولٹ وغیرہ لکھنے کی طرف تھی۔ لیکن اٹھنا بیٹھنا فلم کے لوگوں کے ساتھ ضرور تھا۔ رائل پارک ان دنوں فلمی دنیا کا اہم ترین مرکز تھا۔ یہاں کے برسٹل اور ویسٹ اینڈ ہوٹل میں اس زمانے کی بڑی اہم فلمی شخصیتیں آ کر بیٹھا کرتی تھیں۔ ایسے نوجوان بھی آ کر بیٹھتے تھے جو بعد میں بڑے نامور ہیرو اور فلم کے پروڈیوسر بنے اور جنہوں نے بڑا نام پیدا کیا۔

قیام پاکستان سے پہلے رائل پارک کے فلمی دفاتر پر ہندوؤں کی اجارہ داری تھی۔ اگرچہ اداکار اور ڈائریکٹر زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔ جوہر کامل کی سپلائی بھی مسلمان ہی کرتے تھے۔ پاکستان بنا تو ہندو چلے گئے اور رائل پارک کے دفاتر اور عمارتیں مسلمان مہاجروں کو الاٹ ہونے لگیں۔ آج کل تو یہاں زیادہ تر فلمی دفاتر ہی قائم ہیں مگر شروع شروع میں ہر طبقے کے لوگ یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ایک بلڈنگ کی پہلی منزل ہمارے ایک جاننے والے عبدالمتین صاحب نے اپنے نام الاٹ کرا لی تھی۔ مجھے یاد ہے اس کے کمرے بالکل خالی تھے۔ ایک بڑے کمرے میں صرف ایک صوفہ ہی پڑا تھا۔ یہاں کچھ روز میں احمد راہی اور ساحر لدھیانوی ایک ساتھ رہے تھے۔ بہر حال پھر یہ

بلڈنگ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی اور اب وہاں سرکاری دفاتر قائم ہیں۔

اس رائل پارک کی گلیوں میں ہر قسم کے لوگ رہا کرتے تھے۔ کوئی جالندھر کا تھا۔ کس کا کی تعلق ضلع گورداسپور، ہوشیارپور یا میرٹھ سے تھا تو کوئی کسی گاؤں سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ یہیں ایک گلی میں ضلع امرتسر کے ایک بزرگ بھی آ کر رہنے لگے تھے۔ وہ اپنے ایک بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔ بیٹا اوپر والی منزل پر رہتا تھا۔ بزرگ نے گلی والے چھوٹے سے کمرے میں اپنی چارپائی بچھا لی تھی۔ یہ لوہے کی ہسپتالوں والی چارپائی تھی۔ سامنے دو تین لوہے کی کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ ان بزرگ کی عمر اس وقت ستر کے قریب ہو گی مگر دبلے پتلے جسم میں بڑی توانائی بھری ہوئی تھی۔ باہر کم ہی نکلتے تھے۔ زیادہ وقت چارپائی پر نیم دراز ہو کر پرانی کتب کے مطالعے میں صرف کرتے۔ انھیں نجوم کے علم پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ مشرقی علوم بھی ازبر کر رکھے تھے۔ میری شروع ہی سے یہ عادت رہی ہے کہ میں صاحب علم لوگوں کا بڑا ادب کرتا ہوں اور جہاں کہیں ان کا کوئی سراغ ملے تو ان کے پاس کم از کم ایک مرتبہ ضرور جاتا ہوں۔ میں ایک دن رائل پارک کے برٹل ہوٹل میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے اس بزرگ کا ذکر کیا۔ ان کا اصلی نام تو مجھے کبھی بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ سب لوگ احترام سے انھیں شاہ جی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ وہ آدمی کہنے لگا۔

"شاہ جی اس دور کے بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ عربی فارسی کے ساتھ انگریزی بھی بولتے ہیں۔"

اس آدمی نے کچھ اس انداز میں شاہ جی کی باتیں کیں کہ میرے دل میں ان سے ملنے کی زبردست خواہش پیدا ہو گئی۔ چنانچہ میں اس روز شام سے ذرا پہلے شاہ جی کے دولت خانے پر پہنچ گیا۔ مجھے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ وہ بہت کم کسی سے ملتے ہیں۔ اگر کسی سے ملنا ناگزیر ہو جائے تو مختصر بات کر کے مہمان کو رخصت کر دیتے ہیں۔ میں نے ان کی بیٹھک کے دروازے پر دستک

دی تو اندر سے بڑی تیز اور کرخت آواز آئی۔

"کون ہے بھئی؟"

میں نے کہا۔

"شاہ جی! میں ہوں۔ آپ سے ملنے آیا ہوں"

اسی لہجے اور اسی کرخت لہجے میں اندر سے آواز آئی۔

"جاؤ جاؤ بھائی اپنا کام کرو۔ میرے پاس کسی سے ملنے کا فضول وقت نہیں ہے"

میں ہنس پڑا۔ واقعی یہ آدمی امرتسر کے ضلع کا ہی رہنے والا ہو سکتا تھا۔ میں بھی امرتسر شہر کا پانی پی کر جوان ہوا تھا۔ میں نے فوراً جواب دیا۔

"شاہ جی! اگر آپ لوگوں سے نہیں ملتے تو پھر شہر میں کیوں بیٹھے ہیں۔ جنگل کیوں نہیں چلے جاتے۔ یہاں بیٹھیں گے تو آپ سے محبت کرنے والے آپ کے پاس ضرور آئیں گے۔"

اس کا اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اندر سے کسی نے کنڈی اتاری۔ پھر دروازہ کھلا۔ اور میرے سامنے ایک دبلا پتلا بوڑھا کھڑا تھا جس کا چہرہ تانبے کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ یہی شاہ جی تھے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ مجھ سے پوچھا۔

"کیا تم امرتسری ہو؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں! خاص امرتسر شہر کا رہنے والا ہوں"

شاہ جی نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"آ جاؤ یار اندر"

چھوٹا سا کمرہ تھا۔ لوہے کا پلنگ دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ دیواریں بالکل خالی تھیں۔ کوئی کیلنڈر تک نہیں لگا تھا۔ پلنگ کے پاس فرش پر مٹی کی صراحی پڑی تھی جس کے اوپر تانبے کا گلاس اوندھا رکھا ہوا تھا۔ پلنگ کی ایک جانب

پرانی کتابیں ایک دوسرے کے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔ شاہ جی پلنگ پر نیم دراز ہو گئے۔

"کیا ہو گے بھائی؟ چائے منگواؤں؟"

میں نے کہا۔

"جی نہیں شکریہ! میں تو صرف آپ کا دیدار کرنے آیا ہوں"

شاہ جی تنک کر بولے۔

"کیوں بھائی! میں کوئی فلم ایکٹریس ہوں کہ جس کا دیدار کرنے آ گئے ہو؟ میں نے تمہیں صرف اس لئے اندر بلا لیا ہے کہ امرتسر کے رہنے والے ہو۔ بتاؤ کیا پیو گے؟ چائے پی لو۔ میں بھی چائے پینا چاہتا ہوں"

انہوں نے کڑاکے دار آواز دے کر اوپر کسی کو کہا کہ چائے لے آؤ۔ پھر ایک پرانی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگے۔ میں لوہے کی کرسی پر خاموش بیٹھا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاہ جی نے ورق گردانی کرتے کرتے کتاب ایک دم بند کر دی اور میری طرف اپنی عقابی آنکھیں گھما کر پوچھا۔

"امرتسر سے تم لوگ صحیح سلامت آ گئے تھے؟ کوئی قتل وقتل تو نہیں ہوا؟"

میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ ہم سب لوگ خیر خیرت سے لاہور پہنچ گئے تھے۔"

شاہ جی نے سرہانے کے نیچے سے کنگ سٹارک کی ڈبی نکال کر سگریٹ سلگایا۔ ایک لمبا کش لیا اور اس کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولے۔

"بڑا قتل عام ہوا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہیں میرا پتہ کس نے بتایا؟"

میں نے اس آدمی کا نام بتا دیا جس نے شاہ جی کا ذکر میرے آگے کیا تھا۔ کہنے لگے۔

"بڑا گدھا ہے۔ ہر کسی کے آگے میرا ذکر لے بیٹھتا ہے اور پھر

لوگ مجھے تنگ کرنے آ جاتے ہیں"

میں شرمندہ سا ہو گیا۔ دل میں خیال آیا کہ اٹھ کر واپس چلا جاؤں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر بیٹھا رہا کہ یہ قلندر ٹائپ کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی الگ ادائیں ہوتی ہیں۔ اگر ان سے کچھ حاصل کرنا ہے تو پھر یہ ادائیں برداشت کرنی پڑیں گی۔

اتنے میں اوپر سے ایک لڑکا چائے لے کر آ گیا۔ اس نے کونے والی چھوٹی سی میز گھسیٹ کر سامنے کی اور اس پر چائے رکھ کر بغیر کوئی بات کئے اوپر چلا گیا۔ شاہ جی ابھی تک مطالعے میں منہمک تھے۔ اچانک میری طرف دیکھا اور حکم دیا۔

"بھائی چائے کیوں نہیں بناتے۔ میری پیالی میں آدھی چائے ڈالنا۔"

میں نے شاہ جی کی پیالی میں آدھی چائے ڈالی۔ اپنی پیالی بھی پوری نہ بھری۔ کیونکہ کوئی پتہ نہیں تھا چائے کیسی بنی ہوئی ہے۔ چائے کے معاملے میں میری بھی اپنی قلندرانہ ادائیں ہیں۔ شاہ جی چائے کی پیالی پکڑ کر پلنگ پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے ایک بار پھر کڑک دار آواز میں کہا۔

"اوئے کوئی بسکٹ وغیرہ بھی لے آیا کرو۔"

پھر بڑبڑانے لگے۔ کسی کو گالی دے کر کہا۔

"کوئی نہیں پوچھتا۔ نہ پوچھو۔ میں کہاں تم لوگوں کی پروا کرتا ہوں۔ جہاں جاؤں گا لوگ میرے گرد جمع ہو جائیں گے۔ تمہاری خوش قسمتی ہے تمہارے گھر میں بیٹھا ہوں۔"

میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میں شاہ جی کے گھریلو معاملات میں دخل دینے وہاں آ گیا ہوں۔ اچانک شاہ جی نے میری طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور کہا۔

"نہیں نہیں بھائی! تم اپنے دل میں ایسا خیال نہ لاؤ۔ تم محض محبت

کے خیال سے میرے پاس آ گئے ہو۔ میں جانتا ہوں تمہیں صرف
میری باتیں سننے کا ہی شوق یہاں کھینچ لایا ہے۔ اچھا بتاؤ۔ تم کس
قسم کی باتیں سننا چاہتے ہو؟"

میں کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

"آپ جو بھی باتیں کریں گے میں انہیں بڑے شوق سے سنوں گا"

اس پر شاہ جی ہنس پڑے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے سارے دانت اس
عمر میں بھی اصلی تھے اگرچہ پان کھانے کی وجہ سے میلے لگ رہے تھے۔ میں
نے یونہی ان سے ان کی عمر پوچھی تو انہوں نے فوراً کہا۔

"میری عمر یہی کوئی دو چار سو سال ہو گی"

میں ہنس دیا۔ کہنے لگے۔

"ہنستے ہو؟" وہ سنجیدہ ہو گئے۔ "تمہارا خیال ہے کہ میں مذاق کر رہا
ہوں؟ بھائی میرا تمہارا کوئی مذاق نہیں ہے۔ میں نے تمہیں جو اپنی
عمر بتائی ہے میں اتنی ہی عمر کا ہوں"

شاہ جی نے سگریٹ فرش پر پھینکا اور مجھ سے کہا۔

"اس پر پاؤں مار کر بجھا دو"

میں نے ایسا ہی کیا۔ تب میں نے دیکھا کہ فرش پر سگریٹ بجھنے کے کئی
نشان پڑے ہوئے تھے۔ شاہ جی کے لئے میں نے چائے کی دوسری پیالی بنائی تو
بڑے خوش ہوئے۔ کہنے لگے۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں چائے کی دو پیالیاں ایٹ اے ٹائم پیتا
ہوں؟"

میں نے کہا۔

"بس دل کو دل سے راہ ہوتی ہے"

بولے "سبحان اللہ!" شاہ جی کی زبان سے بے اختیار یہ کلمہ نکل گیا۔
"تم نے میری روح راضی کر دی۔ اچھا۔ میں تمہارا زائچہ بناتا

ہوں۔ جو پوچھو گے زائچہ بتائے گا۔ بولو۔ تمہاری تاریخ پیدائش کیا
ہے؟"

میں نے کہا۔

"شاہ جی! اگر تاریخ پیدائش ہی معلوم کرنی ہے تو پھر آپ کے زائچہ
بنانے کا فائدہ کیا؟"

اس پر شاہ جی ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھتے رہے۔
پھر پوچھا۔

"سچ سچ بتاؤ یہ بات تمہیں کس نے بتائی ہے؟"

میں نے کہا۔

"یقین کریں شاہ جی! مجھے کسی نے نہیں بتائی۔ بس یونہی دل میں
خیال آ گیا تھا"

شاہ جی نے کنگ سٹارک کا نیا سگریٹ لگایا۔ بجھی ہوئی تیلی فرش پر
پھینکی اور سگریٹ کا گہرا کش لگا کر بولے۔

"اچھا۔ برخوردار اب تم جاؤ۔ پھر کسی وقت آنا۔"

میں سلام کر کے دروازے کی طرف بڑھا تو شاہ جی نے کڑک کر کہا۔

"جب بھی آنا اسی وقت آنا۔ اور دروازے پر زور سے ہاتھ نہ
مارنا۔ سمجھ گئے؟"

میں نے کہا۔

"جی سمجھ گیا"

شام کے وقت اشفاق احمد سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے شاہ جی کی
دلچسپ شخصیت کے متعلق بتایا تو وہ کہنے لگا۔

"کل میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا"

اشفاق احمد کو تصوف کے مسئلے مسائل سننے اور بیان کرنے کا شروع ہی سے بڑا شوق تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شاہ جی سے مل کر بڑا خوش ہوگا۔ چنانچہ میں وقت مقررہ پر اسے ساتھ لے کر شاہ جی کے مکان پر پہنچ گیا۔ شاہ جی کی ہدایت کے مطابق میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دوسری دستک پر شاہ جی نے خود دروازہ کھولا۔ ہمیں ایسے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے مجھے پہچان لیا اور اندر آنے کا اشارہ کرکے واپس چلے گئے۔ اشفاق احمد نے مجھے شرارتی نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔

"آجاؤ' یہی شاہ جی ہیں۔"

ہم نے کمرے میں جا کر شاہ جی کو سلام کیا۔ انہوں نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ آج ساری باتیں اشاروں میں ہو رہی تھیں۔ میں اور اشفاق لوہے کی کالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ کمرے کی فضا خوشگوار تھی۔ شاہ جی پلنگ سے ٹیک لگائے کسی بوسیدہ سی کتاب کے مطالعے میں منہمک تھے۔ ہم خاموش بیٹھے رہے۔ شاہ جی ہنس پڑے۔

"واہ! کیسا غلط شعر لکھا ہے اس شاعر نے ——"

پھر کتاب بند کر دی اور اشفاق احمد کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اچھا تو آپ ہیں افسانہ نگار اشفاق احمد؟"

اشفاق احمد شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ہاں جی بس تھوڑا بہت لکھ لیتا ہوں۔"

شاہ جی تنک کر بولے۔

"بھائی یا تھوڑا لکھو یا بہت لکھو۔ یہ تھوڑا بہت کیا ہوا؟"

تصوف کی باتیں شروع ہو گئیں شاہ جی کہنے لگے۔

"یہ تصوف جس کا ذکر عام لوگ کرتے ہیں آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اچھا بھائی اشفاق احمد تم بتاؤ۔ تم تصوف کسے سمجھتے ہو؟"

اشفاق احمد نے جواب میں کچھ کہا۔ شاہ جی بڑے غور سے سنتے رہے۔ سنتے سنتے اور اشفاق احمد کی طرف دیکھتے دیکھتے انہوں نے کڑک کر نعرہ لگایا۔

"اوپر والو! نیچے چائے بھجوا دو۔"

ہم کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے کانپ سے گئے۔ اشفاق احمد کے ہاتھ سے بات کا سرا نکل گیا۔ اس نے دماغ پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی تو شاہ جی بولے۔

"دماغ پر زور مت ڈالو بھائی اشفاق احمد۔ لو سگریٹ پیئو۔"

اشفاق نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔

"میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

"اور کیا پیتے ہو؟ شراب؟"

شاہ جی نے اشفاق کی طرف ذرا سا جھک کر پوچھا۔ اشفاق اور زیادہ شرما گیا اور شرماتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگا۔ شاہ جی ہنستے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ پھر میری طرف دیکھا اور بولے۔

"بھائی! تمہارا یہ دوست مشتاق احمد بڑا مزے دار آدمی ہے۔"

میں نے کہا۔

"شاہ جی! اس کا نام مشتاق احمد نہیں اشفاق احمد ہے۔"

شاہ جی نے ہاتھ کو جھٹک کر کہا۔

"مجھے معلوم ہے یار۔ مجھے معلوم ہے' مجھ سے بحث نہ کرو۔"

اتنے میں اوپر سے وہی نوجوان جو خاموش رہتا تھا چائے لے کر آگیا۔

اس نے حسب معمول خاموشی سے کونے والی تپائی پر چائے کا ٹرے رکھا اور الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ شاہ جی نے مجھے کہا۔

"ڈال دو پیالیوں میں چائے۔ یاد ہے نا؟ مجھے چائے کی آدھی پیالی دینا۔"

ہم چائے پینے لگے۔ اشفاق احمد نے سوال کرنے شروع کر دیئے۔ شاہ جی اس کے ہر سوال کا جواب بڑے مدلل انداز میں یعنی دلیل کے ساتھ دیتے جاتے۔ جہاں اشفاق احمد کو کچھ اختلاف ہوتا اور وہ اس کا اظہار کرتا تو شاہ جی کہتے۔

"تم اختلاف کو اپنی جگہ پر قائم رکھو میں کب کہتا ہوں کہ اختلاف دور کرو؟ جو بات اچھی لگتی ہے اسے مان لو۔ جو اپیل نہیں کرتی اسے چھوڑ دو۔ ہاں آگے بولو۔"

اشفاق احمد بھی بولتا جاتا تھا۔ وہ خوب بولتا رہا۔ دیر تک دونوں میں تصوف کے مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔ میں ان کی بحث بڑے غور سے سن رہا تھا۔ چائے کا دوسرا اور پھر تیسرا دور چلا۔ ہر بار شاہ جی اسی کڑک دار آواز میں نعرہ لگاتے۔

"اوپر والو! اور چائے بھیج دو۔"

اور وہ خاموش نوجوان چائے لے کر آجاتا جس کے بارے میں شاہ جی نے فرمایا تھا کہ میں اسے خاموش فلموں میں سے نکال کر لایا ہوں۔ ان کی بحث سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ ساری باتیں اور سارے مسائل میں پہلے بھی امرتسر میں سن چکا ہوں۔ میرے لئے ان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہاں اگر مجھے کوئی بات اچھی اور نئی لگی تھی تو وہ شاہ جی کی شخصیت تھی۔ وہ بڑے دلچسپ آدمی تھے اور ان کا باتیں کرنے کا انداز بھی سب سے الگ تھلگ تھا۔ مسئلے مسائل پر باتیں کرتے کرتے وہ اچانک رک جاتے اور کوئی ایسی بات کہہ دیتے جس کا زیر بحث موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا مثلاً ایک بار وہ امام غزالی پر بڑی

مدلل باتیں کر رہے تھے کہ ایکدم خاموش ہو گئے۔ ناک کو دو تین بار اوپر چڑھا کر سوں سوں کیا اور محلے میں کسی کو گالی دے کر بولے۔

"اس نے پھر مٹی کے تیل والا چولہا جلایا ہے۔ مٹی کے تیل کی بو مجھے زہر لگتی ہے۔"

اس کے بعد وہ امام غزالی کو بھول گئے۔ کنگ سٹارک کا سگریٹ سلگا کر بولے۔

"سنو! تمہیں زمانہ جاہلیت کے ایک عرب شاعر کے شعر سناتا ہوں۔"

پھر پہلے انہوں نے عرب شاعر کے عربی اشعار سنائے پھر اس کا ترجمہ کر کے سنایا۔

"ان شاعروں پر ہمارے علاقے میں کوئی قابل قدر کام نہیں ہوا۔"

ہمیں وہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اشفاق احمد بھی اٹھنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ ہم اجازت لینے ہی والے تھے کہ شاہ جی نے پلنگ کے پہلو میں رکھی بوسیدہ کتاب اٹھائی اور پلنگ کے ساتھ ٹیک لگا کر اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولے۔

"اچھا' اچھا——— اب تم لوگ جاؤ۔ پھر بھی باتیں کریں گے۔"

ہم دروازہ بند کر کے گلی میں آئے تو ہمیں شاہ جی کی کڑک دار آواز سنائی دی۔ خاموش فلموں سے نکالے ہوئے نوجوان سے مخاطب ہو کر انہوں نے نعرہ لگایا تھا۔

"اوئے برتن اٹھا کر لے جاؤ۔"

میں نے گلی میں سے گزرتے ہوئے اشفاق سے پوچھا۔

"کیا خیال ہے تمہارا؟"

اشفاق بولا۔

"یار بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ بہت لائق بھی ہے۔ یار کیسے کیسے لوگ

شہر کی گلیوں میں گمنام پڑے ہیں۔ اب تم ان کا مقابلہ اپنے ترقی پسند اور رجعت پسند دانشوروں سے کرو۔ تمہیں زمین آسمان کا فرق لگے گا۔"

میں نے کہا۔

"یہ تو ہے۔"

اشفاق کہنے لگا۔

"میں کبھی کبھی شاہ جی کے پاس ضرور آیا کروں گا۔"

مجھے نہیں معلوم کہ اشفاق' شاہ جی سے ملنے رائل پارک کبھی کبھار جاتا تھا یا نہیں لیکن میں ہفتے میں ایک پھیرا شاہ جی کے ہاں ضرور لگا آتا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں پہلی یہ کہ مجھے شاہ جی سے زمانہ جاہلیت کے عرب شاعروں کے شعر سننے کا شوق تھا اور دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ اسی گلی میں مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ محبت کیا ہونی تھی۔ نوجوانی کا زمانہ تھا۔ اس نے مجھے گلی میں سے گزرتے دیکھا۔ وہ مسکرائی' میں بھی مسکرا دیا۔ بس محبت ہو گئی۔ شاہ جی کے ہاں سے واپسی پر میں اس کے مکان میں چلا جاتا۔ اس نے مکان کی پچھلی گلی والا دروازہ کھلا رکھا ہوتا تھا۔ میں اس لڑکی کو ہفتے میں صرف ایک بار ہی مل سکتا تھا۔ اس روز اسے وہاں سے چھٹی ہوتی تھی جہاں وہ سلائی وغیرہ کا کام کرنے جاتی تھی۔ بہرحال یہ ایک الگ داستان محبت ہے۔ میں اس کا تذکرہ یہاں نہیں کروں گا۔"

اشفاق احمد ہفت روزہ "لیل و نہار" کا ایڈیٹر بن گیا۔ "لیل و نہار" پروگریسو پیپرز کا رسالہ تھا اور اس کا دفتر امروز پاکستان ٹائمز والی عمارت یعنی بھارت بلڈنگ میں ہی تھا۔ یہ بلڈنگ اب صاف ہو گئی ہے۔ اس کی جگہ پاٹا مارکیٹ بن گئی ہے۔ جہاں سے اگر آپ چاہیں تو آپ کو اطالوی شوز مل سکتے ہیں۔ اطالوی شوز آپ کو شہر میں اور کسی جگہ نہیں ملیں گے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں تب بھارت بلڈنگ اپنی جگہ پر بوسیدہ حالت میں قائم

تھی۔ اس میں بجلی کے دفاتر بھی ہوتے تھے اور میں اپنے گوالمنڈی والے گھر کا بل جمع کروانے یا بل درست کروانے وہاں جایا کرتا تھا۔ پاکستان ٹائمز اور امروز اخبار کے دفتر میں تو میرا تقریباً روز ہی پھیرا لگتا تھا۔ میرے سبھی ترقی پسند دوست امروز اور پاکستان ٹائمز سے وابستہ تھے۔ "لیل و نہار" شائع ہونا شروع ہوا تو وہاں مزید دوست آ گئے اور خوب محفلیں لگنے لگیں۔ جس زمانے میں میری "آفاق" اخبار میں رات کی ڈیوٹی ہوتی تھی تو میں رات کے ایک ڈیڑھ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر "امروز" اخبار کے دفتر کا چکر لگا کر اپنے گوالمنڈی والے گھر جاتا تھا۔

مجھے یاد ہے گرمیوں کی راتوں کو امروز کا رات کی شفٹ والا عملہ باہر کھلی چھت پر بیٹھا کام کر رہا ہوتا تھا۔ اوپر رسی کے ساتھ بلب روشن ہوتے تھے۔ حمید ہاشمی شفٹ انچارج ہوتا تھا۔ میں تھوڑی دیر وہاں بیٹھ جاتا۔ حمید ہاشمی مجھ سے ضرور پوچھتا کہ "آفاق" نے آج کیا ہیڈ لائن لگائی ہے۔

امروز کے دفتر میں جہاں ایڈیٹر کا کمرہ تھا وہاں سے اس بلڈنگ کی چیمبرلین روڈ والی ایک تنگ سی گلی نظر آیا کرتی تھی۔ یہ گلی آگے جا کر بند ہو جاتی۔ اس میں شروع شروع میں ہمیں ایک مکان الاٹ ہوا تھا۔ الاٹ کہاں ہوا تھا بس ہم نے قبضہ کر لیا تھا۔ میں اور میرا ایک گوالمنڈی کا دوست اس مکان کی دوسری منزل پر پہلی بار گئے تو مکان تقریباً لوٹا جا چکا تھا۔ ایک الماری پر ابھی تک تالا لگا تھا۔ ہم نے تالا توڑا اور اندر اسکول کی کتابیں' کاپیاں اور ایک چھوٹی سی بٹنوں کی ٹوکری پڑی تھی۔ میں نے ٹوکری باہر نکالی۔ ٹوکری میں ململ کا ایک آدھا کڑھا ہوا رومال تھا۔ ڈی' ایم' سی کے رنگدار دھاگوں کی تین چار گچھیاں' ایک لیڈی رسٹ واچ اور پانچ روپے کا نوٹ بھی تھا۔ لیڈی رسٹ واچ میرے دوست نے رکھ لی اور میں نے پانچ روپے کا نوٹ رکھ لیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا تھا کہ یہ کڑھائی ضرور کوئی ہندو یا سکھ لڑکی کرتی ہو گی۔ یہ رسٹ واچ اور پانچ روپے کا نوٹ بھی اسی کا ہو گا۔ خدا جانے اسے اپنے گھر

والوں کے ساتھ کن حالات میں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ خدا جانے وہ زندہ بھی
ہوگی یا راستے میں اغواء ہو گئی ہوگی؟ اس قسم کے خیالات میرے ذہن میں
آتے رہتے تھے مگر مجھے پانچ روپے کے نوٹ کی بڑی خوشی تھی۔ میں نے
گوالمنڈی میں جا کر اسی وقت تکے کھائے تھے۔

اس بلڈنگ میں "لیل ونہار" کے دفتر کی کھڑکیاں میو ہسپتال کی طرف
کھلتی تھیں۔ "لیل ونہار" کا دفتر پہلے پہل نکلسن روڈ پر انور کارٹونسٹ والی
بلڈنگ میں ہوتا تھا۔ پہلے فیض صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ پھر سید سبط حسن
اس کے ایڈیٹر ہو گئے۔ پتہ نہیں پہلے وہ تھے کہ پہلے سبط صاحب تھے۔ بہرحال
سبط حسن کے زمانے میں "لیل ونہار" بڑے کمال کا رسالہ ہوتا تھا اور اس
نے کافی مقبولیت حاصل کی تھی۔ اشفاق احمد نے آکر ظاہر ہے اس پر اپنی
چھاپ لگائی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رسالہ "لیل ونہار" چوں چوں کا مربہ
بن گیا۔ اسے پڑھتے ہوئے کبھی لگتا کہ یہ لیل و نہار ہے۔ کبھی لگتا کہ نہیں یہ
لیل و نہار نہیں ہے۔ یہ "داستان گو" ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ادب میں
سبط حسن اور فیض صاحب کا اپنا ایک نظریہ تھا جبکہ اشفاق احمد کا کوئی طے
شدہ نظریہ نہیں تھا۔ مجھے نہ تو سبط حسن والے نظریے سے کوئی دلچسپی تھی اور
نہ اشفاق احمد کے کوئی نظریہ نہ ہونے سے کوئی سروکار تھا۔ مجھے صرف اشفاق
احمد سے دلچسپی تھی۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میرا یار "لیل و نہار" میں
آگیا ہے۔

ادھر ادھر سے پھرتا پھراتا میں "لیل ونہار" کے دفتر میں آجاتا اور
اشفاق کے پاس بیٹھ جاتا۔ ہم خوب باتیں کرتے۔ پھر اس کے کمرے سے اٹھ
کر آرٹسٹ زیدی کے پاس چلا آتا۔ زیدی بڑا اچھا آرٹسٹ تھا اور آدمی بھی
بہت کمال کا تھا۔ اس کی خاموش گفتگو میں بڑی گرمی اور محبت تھی۔ اس کی
لائن میں زبردست ایکسپریشن ہوتا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے کارٹون لیل ونہار
کی جان ہوتے تھے۔

پھر خدا جانے سیاست نے کیا رنگ بدلا کہ اشفاق کی جگہ صوفی تبسم
"لیل ونہار" کے ایڈیٹر بن گئے۔ رہی سہی کسر صوفی صاحب نے پوری کر دی
اور "لیل و نہار" ایک گمنام سا پرچہ بن کر رہ گیا۔ صوفی صاحب کے دفتر کی بھی
دھج نرالی تھی۔ وہ اپنا حقہ ساتھ لاتے تھے۔ ان کی چلم ان کے گھر سے بھر کر
لائی جاتی تھی۔ ایک خاص ملازم ہوتا تھا اس کا نام بھول گیا ہوں۔ وہ حقے کی
بڑی سی چلم لے کر سائیکل پر سوار ہو کر صوفی صاحب کے گھر سمن آباد پہنچتا۔
وہاں چلم میں خاص اہتمام کے ساتھ تمباکو بھرا جاتا۔ اس کے اوپر کپاس کے
سرکنڈوں کی آگ جلائی جاتی اور ملازم سائیکل پر بیٹھ کر جب چلم ہاتھ میں
اٹھائے لیل ونہار کے دفتر میں واپس آ رہا ہوتا تو چلم میں سے دھواں اٹھ رہا
ہوتا اور یوں لگتا جیسے کوئی اتھلیٹ اولمپک گیمز کی شمع لے کر چلا آرہا ہے۔
سبط حسن نے "لیل ونہار" کو جس مقام تک پہنچایا تھا یہ رسالہ پھر وہاں تک نہ
پہنچ سکا اس مقام سے نیچے ہی نیچے گرتا گیا اور آخر ایک روز بند کر دیا گیا۔

اب ہم ریڈیو سٹیشن کی نئی عمارت میں آگئے تھے۔ یہ عمارت ایمپریس
روڈ کے شملہ پہاڑی والے کونے کے شروع میں واقع ہے۔ ایک مدت تک
عمارت زیر تعمیر رہی۔ عمارت بن کر تیار ہو گئی۔ اس میں ساز وسامان بھی لگا دیا
گیا۔ مگر ریڈیو کے عملے کو منتقل نہیں کیا جا رہا تھا۔ جن لوگوں نے عمارت بنائی
تھی وہ وہاں اپنی فیملی کے ساتھ مزے سے رہ رہے تھے۔ ان ہی دنوں رن کچھ
میں پاک بھارت جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ میوزک ڈائریکٹر شہریار نے نور جہاں
کی آواز میں مشہور ملی ترانہ پرانے ریڈیو سٹیشن کی بجائے نئے ریڈیو سٹیشن
کے سٹوڈیو میں جا کر ریکارڈ کروایا۔ یہ ملی نغمہ تھا:

اے وطن کے سجیلے جوانو!
میرے نغمے تمہارے لئے ہیں

نغمہ نگار قتیل شفائی تھا مگر نام جمیل الدین عالی کا لکھا گیا۔ اس کی بھی
ایک وجہ تھی جس کا ذکر کرنا میں یہاں مناسب نہیں سمجھتا۔ اتنا ضرور کہوں گا

کہ جمیل الدین عالی کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔

خدا خدا کر کے ہم لوگ پرانے ریڈیو کی بوسیدہ عمارت کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر نئی عمارت میں منتقل ہوگئے۔ یہاں آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد سن پینسٹھ کی پاک بھارت جنگ شروع ہوگئی۔ اشفاق احمد اب باضابطہ طور پر ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک نہیں تھا۔ مگر ریڈیو کے لئے مسلسل لکھتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے ایسے ایسے ریڈیو ڈرامے اور فیچر لکھے جو یادگار رہیں گے۔ اس کا مقبول عام فیچر "تلقین شاہ" چل رہا تھا اور ترقی کی منازل طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ جنگ شروع ہوئی تو تلقین شاہ فیچر اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ ریڈیو پاکستان لاہور نے بھی پاکستان بھارت جنگ میں اپنا قومی کردار دوسرے اداروں کی طرح بڑی کامیابی سے نبھایا۔ شہر کا کوئی ادیب اور شاعر ایسا نہیں تھا جس نے ریڈیو کو اپنی بلامعاوضہ خدمات نہ پیش کی ہوں۔

اشفاق احمد تلقین شاہ کے ساتھ دوسرے فیچر بھی لکھتا۔ تقریریں بھی کرتا اور اپنے دوسرے ساتھی ادیب اور شاعروں کے ساتھ قوم کے جذبوں کو بلند رکھنے کے لئے اپنا ملی فرض ادا کرتا رہا۔ میں اب ریڈیو کے ساتھ باقاعدہ طور پر منسلک ہوگیا ہوا تھا اور سارا دن بلکہ رات گئے تک ریڈیو سٹیشن پر ہی رہتا۔ کوئی فیچر لکھنا ہوتا تو فیچر لکھتا۔ چھوٹی سی تقریر لکھنی ہوتی تو وہ بھی لکھتا۔

جنگ ختم ہوگئی۔ قوم اس آزمائش میں سے سرخ رو ہو کر نکلی۔ قوم کو ایک نیا جذبہ ایک نئی طاقت ملی۔ ریڈیو کے پروگراموں کو نئے تقاضوں کی روشنی میں ترتیب دیا گیا لیکن جیسا کہ قوموں کی تاریخ میں اکثر ہوتا آیا ہے کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد ریڈیو کے پروگرام پھر پرانی ڈگر پر واپس آگئے۔ اس کے باوجود اشفاق احمد' میرزا ادیب' ناصر کاظمی اور صوفی تبسم ایسے ادیبوں اور شاعروں نے ریڈیو کے معیار کو کافی حد تک بلند کئے رکھا۔

اشفاق کے ساتھ میرا نئے ریڈیو سٹیشن والا زمانہ بھی بڑا یادگار زمانہ تھا۔ اگرچہ وہ ریڈیو سٹیشن روز نہیں آتا تھا مگر ہفتے میں دوبار اس کا پھیرا ضرور

ہوتا اور ہم کافی وقت ایک دوسرے کے ساتھ گذارتے۔ کبھی کمرے میں بیٹھ جاتے۔ کبھی ریڈیو کی کنٹین میں بیٹھ کر چائے پیتے اور کبھی سٹوڈیو کے اندر ہی بیٹھے دیر تک باتیں کرتے۔ اسی دوران ٹیلی ویژن سٹیشن قائم ہوگیا۔ یہاں اشفاق احمد کے مزید جوہر کھلے۔ اس نے اور بانو قدسیہ نے مل کر ٹیلی ویژن کے لئے لکھنا شروع کر دیا۔ مل کر لکھنے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ دونوں ایک پلے مل کر لکھتے تھے۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ دونوں الگ الگ ڈرامے اور سیریل وغیرہ لکھتے تھے۔ اشفاق نے ٹیلی ویژن پر ریڈیو کے اپنے فیچر "تالی دے تھلے" کو پھر سے شروع کر دیا۔ جسے لوگوں نے پسند کیا۔ پھر اس نے ایک محبت سو افسانے کے نام سے ڈراموں کا سلسلہ لکھا۔ یہ ڈرامے وہ اپنی مرضی سے بغیر کسی کا خیال کئے لکھتا۔ لوگوں کو بعض اختلافات بھی پیدا ہوئے۔ بعض نے کہا کہ ڈراموں میں کردار بڑے لمبے لمبے ڈائیلاگ بولتے ہیں۔ مگر مجموعی طور پر یہ سلسلہ بھی بہت پسند کیا گیا۔

اب میں تھوڑا اور پیچھے کی طرف جاتا ہوں۔

اشفاق نے ماڈل ٹاؤن میں زمین لے کر اپنا مکان بنانا شروع کیا۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس نے مجھے وہ پلاٹ دکھایا۔ یہ پلاٹ C بلاک میں تھا اور ماڈل ٹاؤن میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کو تھا۔ اس وقت تو وہاں بڑی ہی پرسکون فضا تھی۔ اب اس فضا کے سکون میں رکشوں وغیرہ نے تھوڑا خلل ڈالا ہے۔ پھر بھی شہر والا حال نہیں ہے۔ میں نے اشفاق سے کہا کہ پلاٹ کے درمیان میں ایک درخت ضرور لگائے۔ اس نے اپنی پسند کے زرد بانس بھی لگوائے جو اب کافی بڑے ہوگئے ہیں۔ اس کوٹھی کا نقشہ اس نے خود تیار کیا تھا۔ یعنی وہ جس طرح کا مکان یا مکانیت چاہتا تھا اس نے اسی طرح کی کوٹھی بنوائی۔ ڈرائنگ روم لمبا اور کافی کشادہ ہے۔ سامنے والی ساری کی ساری دیوار میں موٹے شیشے لگے ہیں جس سے روشنی خوب آتی ہے اور شور بھی باہر ہی رہتا ہے۔

اس سے بھی پہلے کی بات ہے کہ لاہور میں ایک نوجوان کے ہاتھوں لڑائی جھگڑے میں دوسرا آدمی شدید زخمی ہوگیا اور ہسپتال میں جا کر فوت ہوگیا۔ اس نوجوان پر مقدمہ چلا اور اسے پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ باپ نے اپیل کی۔ ہائی کورٹ اور اس کے بعد سپریم کورٹ نے بھی سزا بحال رکھی۔

بوڑھا باپ اشکبار آنکھوں کے ساتھ اشفاق احمد کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس نے جان بوجھ کر کسی کو نہیں مارا۔ بس لڑائی ہوئی اور مخالف کا خون ہوگیا۔ اب اس کی رحم کی اپیل صدر ایوب کے پاس گئی ہوئی ہے۔ اگر اسے پھانسی ہوگئی تو اس کے ساتھ میں بھی مرجاؤں گا۔ اس کی بہنیں اور ماں بھی مرجائے گی۔ ہمارا سارا گھر مرجائے گا۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ میرے بچے کو بچا لیجئے۔"

اشفاق احمد نے کہا۔

"محترم! مجھے آپ کے ساتھ پوری ہمدردی ہے مگر میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

اس وقت تک اشفاق احمد کہتا ہے کہ میرا خیال اپنے اس دوست کی طرف نہیں گیا تھا جو ان دنوں صدر ایوب کا ایک طرح سے پی' آر' او ہوتا تھا۔ بدنصیب لڑکے کا غم زدہ باپ یہ سارا کچھ معلوم کرکے اشفاق کے پاس پہنچا تھا۔ چنانچہ جب اس نے پی' آر' او کا نام لے کر کہا کہ آپ انہیں کہیں کہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرکے صدر ایوب سے میرے بچے کی رحم کی اپیل منظور کرا دیں۔ تب اشفاق احمد ساری بات سمجھ گیا۔ لیکن اس نے لڑکے کے باپ کو زیادہ تسلی نہ دی کیونکہ وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔

"محترم! میں انہیں فون کرکے ضرور معلوم کروں گا کہ وہ اس سلسلے میں کیا مدد کرسکتے ہیں؟۔"

بدنصیب لڑکے کا باپ رونے لگا۔ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اشفاق خود صاحب اولاد تھا۔ اس کا دل دہل گیا۔ اس نے فوراً کراچی جانے کا فیصلہ کرلیا اور لڑکے کے باپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہوگا تو سب کچھ وہی جو خدا کو منظور ہوگا۔ مگر میں ایک بار کوشش ضرور کرکے دیکھتا ہوں۔ اگر بچے کی زندگی باقی ہے تو وہ انشاء اللہ ضرور بچ جائے گا۔"

لڑکے کے باپ کی جان میں جان آگئی۔ کیونکہ کسی نے اس سے کہا تھا کہ اگر اشفاق حامی بھرلے گا تو پھر آپ کا کام ہو جائے گا۔

اشفاق احمد نے حامی بھری اور شام کو میرے پاس آکر مجھے سارا قصہ سنایا اور کہا۔

"تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

میں اسی وقت تیار ہوگیا۔ شالیمار ایکسپریس ان دنوں نئی نئی چلی تھی۔ ہم نے اس ٹرین میں دو سلیپر بک کرائے اور کراچی روانہ ہوگئے۔ اشفاق نے اپنے دوست کو کراچی میں ٹیلی فون کردیا تھا کہ وہ ایک انتہائی ضروری اور ذاتی مسئلے پر بات کرنے آ رہا ہے۔ وہ میرا بھی دوست تھا۔ میں اس کا فرضی نام شہباز لکھ دیتا ہوں۔

ہم کراچی پہنچنے کے بعد ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھے شہباز کی کوٹھی پر آگئے۔ وہ ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ فوراً اشفاق سے پوچھنے لگا۔

"بات کیا ہے؟ خیر تو ہے۔ تم یونہی آنے والے نہیں ہو۔"

اشفاق نے کہا۔

"ذرا سانس تو لینے دو۔ ساری بات بتاتا ہوں۔"

شام ہو رہی تھی۔ ہم کوٹھی کے ٹیرس میں بیٹھ گئے۔ کراچی کی شام کی ہوا چل رہی تھی۔ یہ ہوا میری بھی محبوبہ رہ چکی ہے۔ یہ ہوا ہی مجھے لاہور

سے کراچی کھینچ کر لے جایا کرتی تھی۔ میں ان دنوں کراچی جانے اور اسی ہوا سے ملاقات کرنے کے بہانے تلاش کیا کرتا تھا۔ ذرا سا کام نکلتا تو میں فوراً کراچی روانہ ہو جاتا۔ سارا دن کسی جگہ بیٹھا شام ہونے کا انتظار کرتا رہتا۔ جیسے ہی شام ہوتی اور سمندر کی طرف سے آنے والی میری محبوبہ ہوا مجھ سے ملنے نکلتی تو میں بھی اپنی کمیں گاہ سے نکل آتا۔ سیدھا یام گروو میں یا کسی دوسری جگہ بیٹھ کر بیئر پیتا اور پھر اپنی محبوبہ کراچی کی شام کی ہوا کی بانہوں میں بانہیں ڈالے سڑک پر نکل آتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے ملتے۔ ایک دوسرے کا حال پوچھتے۔ وہ مجھے دور سمندر پار رہنے والے لوگوں' ان کے شہروں' ان شہروں کے ملکوں' ان ملکوں کے جنگلوں' وہاں کے گرجا گھروں' گرجا گھروں کے پر سکون خوبصورت قبرستانوں' وہاں کے مے خانوں اور ان مے خانوں میں رقص کرنے والیوں کی باتیں بتاتی اور ہم اپنے راز و نیاز میں مصروف سڑک پر نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے۔

اس وقت بھی جب میں اور اشفاق اپنے مشترکہ دوست شہباز کی کوٹھی کے ٹیریس پر بیٹھے تھے تو شام کی ہوا چل پڑی۔ ہوا نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ سمندر کے اوپر سے ہوتی ہوئی سیدھی میرے پاس آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہاں سے اٹھ چلنے کو کہا۔

میں خود اس کے ساتھ جانے کو بے تاب ہو گیا تھا۔ مگر میری مجبوری تھی۔ وہاں سے ہل نہیں سکتا تھا۔ میں نے اسے اپنی مجبوری بتانی چاہی تو شام کی ہوا نے کہا۔

"میں سب جانتی ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں جاتی ہوں۔"

اور وہ آہیں بھرتی مسکراتی میرا ہاتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ اس وقت شہباز' اشفاق احمد سے پوچھ رہا تھا۔

"اب کھل کر بات کرو۔ کیا معاملہ ہے؟"

اشفاق احمد نے شروع سے آخر تک سارا معاملہ اس کے گوش گذار

دیا۔ سب کچھ سن چکنے کے بعد شہباز بولا۔

"اگر اس لڑکے کی رحم کی اپیل صدر کے پاس آئی ہوئی ہے تو میں سب سے پہلے اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے دیکھے اور فائل کو پڑھے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

دوسرے روز دفتر جانے کے بعد شہباز نے رحم کی اپیل والی فائل کا پورا مطالعہ کیا۔ دوپہر کے بعد کوٹھی پر واپس آیا تو کہنے لگا۔

"اشفاق یار! اس میں تو قانونی طور پر کوئی بھی نقطہ اس لڑکے کے حق میں نہیں جاتا۔ یہ فائل جب صدر کے سامنے گئی تو وہ رحم کی اپیل مسترد کر دے گا۔ کیونکہ دوسری وزارتوں کی رائے پڑھ کر ہی صدر نے کوئی فیصلہ کرنا ہوتا ہے اور متعلقہ وزارتوں کے سیکرٹریوں نے لڑکے کے خلاف ہی لکھا ہے بلکہ سفارش کی ہے کہ اس کی رحم کی اپیل منظور نہ کی جائے۔"

اشفاق احمد پریشان ہو گیا۔ میں بھی پریشان ہو گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے لڑکے کے باپ کا غم زدہ اشکبار چہرہ آ گیا۔ اشفاق احمد کہنے لگا۔

"اگر ایسی ویسی بات ہو گئی تو اس کا باپ ماں بہنیں سب مر جائیں گی۔"

شہباز نے کہا:

"اس نے بھی تو بڑا ظلم کیا ہے۔ ایک انسان کی جان لی ہے۔"

اشفاق بولا۔

"بس یار جو ہونا تھا ہو گیا ہے۔ اب اگر کوئی صورت ہو سکتی ہے تو کچھ کرو۔ میرا مطلب ہے اسے پھانسی نہ ہو عمر قید ہو جائے۔ یہ بھی ایک طرح کافی سخت سزا ہوتی ہے۔ ساری جوانی جیل میں ختم ہو جائے گی اس کی۔"

شہباز سوچنے لگا۔ پھر بولا۔

"میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ یہ فائل صدر کے آگے پیش نہ کروں۔"

اشفاق نے پوچھا۔

"تم کب تک اسے اپنے پاس رکھو گے؟ ایک نہ ایک دن تو تمہیں یہ فائل پیش کرنی ہی پڑے گی۔ آخر پھانسی کے کیس کی فائل ہے۔"

شہباز کہنے لگا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس فائل کے بارے میں حکم ہے کہ جتنی جلدی ہوسکے اسے آگے دوسرے متعلقہ افسر تک پہنچایا جائے۔ پھر بھی میں تمہاری خاطر کوشش کروں گا کہ اسے جتنی دیر تک غائب کر سکوں غائب کر دوں۔ جب پیچھے سے بہت ہی دباؤ پڑے گا تو پھر مجبوراً نکال کر پیش کر دوں گا۔ آگے جو لڑکے کی قسمت۔ اگر اس کی زندگی ابھی باقی ہے تو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

اشفاق نے کہا۔

"چلو۔ یہی غنیمت ہے۔ تم فی الحال فائل اپنے پاس ہی رکھو۔"

شہباز فوراً بولا۔

"اپنے پاس نہیں رکھ سکوں گا بھائی میں تو اسے کسی الماری میں بند کر دوں گا لیکن یہ ضرور بتائے دیتا ہوں اور تم لڑکے کے والد کو بھی بتا دینا کہ اگر پیچھے سے زور پڑا اور پیچھے سے زور ضرور پڑے گا تو پھر مجھے فائل نکال کر پیش کرنی ہی پڑے گی۔ میں اسے کچھ عرصے کے لئے غائب تو کر سکتا ہوں مگر اسے ضائع نہیں کر سکتا۔"

"ہاں بھئی! یہ تو بالکل ناممکن ہے۔"

اشفاق نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ یہی بات بہت تھی۔ ورنہ کوئی اتنی خطرناک ذمہ داری لیتا ہے۔ صرف اشفاق کے کہنے پر شہباز اس

خطرناک کام کے لئے تیار ہو گیا تھا اور اشفاق محض ایک غم زدہ باپ اور اس کی اولاد سے محبت کی خاطر یہ سب کچھ کر رہا تھا۔

ہم دو راتیں کراچی میں گزارنے کے بعد لاہور واپس آ گئے۔ لڑکے کا باپ بے چینی سے امید و بیم کے عالم میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اشفاق کے مکان پر بیٹھا تھا۔ میں بھی وہیں تھا۔ اشفاق احمد نے بڑی دانشمندی کے ساتھ آہستہ آہستہ اسے ساری بات بیان کر دی۔ لڑکے کے باپ نے ٹھنڈی آہ بھری اور بولا۔

"خدا آپ کے بچوں کو سلامت رکھے۔ میرے لئے اتنی تسلی ہی بہت ہے۔ آپ نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے۔ میرے اللہ نے چاہا تو میرا بیٹا ضرور بچ جائے گا۔"

وقت گزرنے لگا۔ لڑکے کا باپ دوسرے تیسرے روز اشفاق کے پاس آ کر پتہ کر جاتا۔ وہ سکریٹریٹ بھی جاتا۔ یہ معلوم کرنے کہ کہیں کراچی سے فائل واپس تو نہیں آ گئی۔ مگر فائل تو شہباز نے الماری میں بند کر کے رکھ دی تھی۔ بس اللہ توکل ہی رکھ دی تھی کہ اگر پیچھے سے زور پڑا تو جتنی دیر تک ٹال سکا حملے کی یلغار کو ٹالوں گا۔ جب بے بس ہو گیا تو فائل پیش کر دوں گا۔

حیرانی کی بات ہے کہ جو فائل چار پانچ دن سے زیادہ صدر کے سیکرٹریٹ میں نہیں ٹھہر سکتی اسے وہاں رکے چھ مہینے گزر گئے۔ شہباز نے بعد میں بتایا کہ پیچھے سے ریمائنڈر آتے تھے اور میں انہیں گول کر جاتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں اس ریمائنڈر کے انتظار میں تھا جسے میں گول نہیں کر سکتا تھا۔

ایک دن کی بات ہے کہ لڑکے نے جو پھانسی کی کوٹھڑی میں تھا اپنے باپ کو پیغام بھجوایا کہ پھانسی دینے والی کوٹھڑی کی صفائی ہو رہی ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ صبح مجھے ہی پھانسی دی جا رہی ہے۔ پریشان حال باپ اسی وقت روتا ہوا اشفاق کے مکان پر آ گیا اور ساری بات روتے ہوئے بیان کی۔ اشفاق نے اسی لمحے کراچی اپنے دوست کو فون کیا اور پوچھا کہ وہ چیز جو میں تمہارے پاس

امانت کے طور پر چھوڑ آیا تھا وہ تم نے آگے پیش کر دی ہے کہ نہیں؟"

دوسری طرف سے شہباز نے جواب دیا۔

"تمہاری امانت میری الماری میں بند پڑی ہے۔"

اشفاق نے لڑکے کے باپ کو بتایا تو باپ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"خدا کے لئے اپنے دوست سے کہیں کہ وہ الماری کھول کر دیکھ آئے۔ میری تسلی ہو جائے گی۔"

اشفاق نے شہباز سے کہا۔

"یار الماری کھول کر دیکھ آؤ کہ میری امانت تمہاری الماری میں ہی ہے۔"

شہباز بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تم ہولڈ کرو۔ میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔"

اشفاق نے لڑکے کے باپ سے کہا۔

"وہ الماری کھول کر فائل دیکھنے گیا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اشفاق نے ہیلو ہیلو کیا تو دوسری طرف سے شہباز کی آواز آئی۔

"میں دیکھ آیا ہوں یار۔ فائل اسی طرح الماری میں بند پڑی ہے۔ مگر اب اس کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ ریمانڈر پر ریمانڈر آ رہے ہیں۔ لگتا ہے یہ فائل مجھے اب صدر کو پیش کرنی ہی پڑے گی۔"

اشفاق نے کہا۔

"جب تک رکھ سکتے ہو اپنے پاس ہی رکھو۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

اشفاق نے فون بند کر دیا۔ لڑکے کا باپ اشفاق کا ہاتھ اپنی آنکھوں کے ساتھ لگا کر ہچکیاں بھر کر رونے لگا۔

○

اب ایسا اتفاق ہوا کہ یوم پاکستان آ گیا۔

لڑکے کی زندگی اللہ میاں نے لکھ رکھی تھی۔ شہباز نے اس کی رحم کی اپیل کے ساتھ ایک نوٹ لکھا جس میں اس بات پر زور دیا کہ لڑکا ماں باپ کا اکلوتا فرزند ہے۔ اپیل صدر کے پاس پیش ہوئی۔ صدر نے موت کی سزا عمر قید میں تبدیل کر دی۔ باپ کو علم ہوا تو وہ سجدے میں گر گیا۔ دوڑا دوڑا اشفاق کے گھر آیا اور رو رو کر اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

اشفاق احمد کا دل اولاد کی محبت کے جذبے سے لبریز ہے۔ وہ دوسروں کی اولاد سے بھی محبت کرتا ہے اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور ہمیشہ خیر کی دعا مانگتا ہے۔

صدر ایوب کی جانب سے مغربی پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں بھی جمہوریت ٹرین چلائی گئی جس میں مشرقی پاکستان کے علاوہ مغربی پاکستان کے دانشوروں' ادیبوں' شاعروں اور صحافیوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس کا مرکزی خیال قدرت اللہ شہاب کی فکر کا نتیجہ تھا جو ان دنوں صدر ایوب کے سیکرٹری تھے۔ پاکستان کے کونے کونے میں رہنے والے ادیبوں' شاعروں' دانشوروں کو دعوت نامے بھیجے گئے۔ میں بھی ابن انشاء اور حفیظ جالندھری کے ساتھ ڈھاکہ پہنچ گیا۔ وہاں اشفاق احمد پہلے سے موجود تھا۔ کیونکہ ٹرین کے سفر کے بعد ڈھاکہ میں ادیبوں' دانشوروں کی ایک آل پاکستان کانفرنس بھی ہونے والی تھی جس کے انتظام و انصرام کی خاطر اشفاق احمد کچھ روز پہلے وہاں پہنچ گیا تھا۔

ہمیں ایم پی اے ہوسٹل میں ٹھہرایا گیا۔ اشفاق احمد وہاں چیف سیکرٹری کے بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ہماری روزانہ ہی ملاقاتیں ہوتیں۔ دو روز بعد جمہوری ٹرین کا سفر شروع ہو گیا۔ یہ سفر ڈھاکہ کے کملا پور ریلوے سٹیشن سے شروع ہوا۔ اس ٹرین نے سارے مشرقی پاکستان میں جہاں جہاں ریلوے لائن گئی ہوئی تھی سفر کرنا تھا۔ ہمیں تین چار دن لگ گئے۔ راستے میں جہاں دریا آ جاتا وہاں سے ہم سٹیمروں میں بیٹھ کر سفر کرتے۔ ہم کاکس بازار بھی گئے۔ وہاں لہراتے ناریلوں والے گرم سمندری ساحل پر بھی لمبی لمبی سیریں کیں۔ میرے لئے پرانی یادوں کی تجدید کا زمانہ تھا۔ مجھے لنکا کا سمندری ساحل اور کلکتہ میں دریائے ہگلی کے کنارے مرطوب ہواؤں میں لہراتے ناریلوں کے درخت یاد آ رہے تھے۔ اشفاق احمد میرے ساتھ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ مجھے خدا نے شاید صرف ناریل کے درختوں' جنوبی سمندروں کی موسلا دھار بارشوں اور گھنے گرم جنگلوں میں بھیگتے بانس اور کیلے کے درختوں سے محبت کرنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ کیونکہ جب بھی میں بالکل نیوٹرل ہو کر اپنے دل کو ٹٹولتا ہوں تو اس میں جنوب مشرقی سمندروں کی مرطوب ہواؤں' ان ہواؤں میں لہراتے ناریل اور کیلے کے درختوں' بانس کے جھنڈوں میں برستی بارش' پوٹھوہار کے دھریک کے کاسنی پھولوں' ایمن آباد کے موتیے کے پھولوں اور شالامار باغ کے آم کے درختوں اور لاہور کی نیم تاریکی گلی کوچوں اور سکول کو جاتی معصوم بچیوں اور لنکا کی چائے اور اعلیٰ ترین سگریٹ کی محبت کے سوا مجھے کسی دوسری چیز کی اتنی محبت نظر نہیں آتی۔ اگر نظر آتی بھی ہے تو وہ مٹ جانے والی محبت ہوتی ہے۔ ہاتھ میں آ کر ہاتھ سے نکل جانے والی محبت ہوتی ہے۔ چنانچہ کاکس بازار کے سمندری ساحل پر جب میں اشفاق احمد کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا تو میں ایک بالکل ہی مختلف آدمی تھا۔ اگر اس وقت اشفاق میرا سمندروں' جنگلوں' بارشوں' سیلون کی چائے اور قدیم قلعوں کے پرانے باغوں سے محبت کرنے والا چہرہ دیکھ سکتا تو وہ یہی سمجھتا کہ اس کے ساتھ اے

حمید کی بجائے کوئی دوسرا شخص چل رہا ہے لیکن وہ میرا یہ چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرا یہ چہرہ صرف لاہور کے درخت اور رات کو آسمان پر چمکنے والے ستارے اور اعلیٰ ترین سگریٹ ہی دیکھ سکتے ہیں۔ یا جب کبھی میں پوٹھوہار کے خوشبودار جیالے کھیتوں میں سے گذر رہا ہوتا ہوں اور بارش شروع ہو جاتی ہے اور بارش مجھے اپنا آئینہ دکھاتی ہے تو وہ اس آئینے میں میرا چہرہ دیکھ لیتی ہے اور بڑی خوش ہوتی ہے اور مجھ سے باتیں کرتی ہے۔

بارش میری محبوبہ ہے۔ ہم دونوں بادلوں کی چھاؤں میں جنگلوں' کھیتوں' پہاڑوں اور درختوں کے جھنڈوں میں چھپ چھپ کر ملتے ہیں۔ وہ میری زبان میں مجھ سے باتیں کرتی ہے۔ میں اس کی زبان میں اس سے باتیں کرتا ہوں۔

کاکس بازار کا سمندری ساحل بڑا لمبا ہے۔ ایک جانب ناریل کے درختوں کے جھنڈ دور تک چلے گئے ہیں دوسری جانب گہرا سبز سمندر حد نگاہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سمندر میں میں سفر کر چکا ہوں۔ چار دن کا سفر تھا۔ آگے جا کر یہ سمندر گہرا سیاہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اس کا نام کالا پانی پڑ گیا ہے۔ ہم دور تک نکل گئے تھے۔ وہاں سے واپس ہوئے اور ریت کا ساحل چھوڑ کر ناریلوں کے نیچے آ گئے۔ ناریل کے درختوں کی چھاؤں میں بڑی خوشبودار جنوب مشرقی ایشیائی گرمائش تھی۔ یہ میری روح اور میرے جسم کا حصہ تھی۔ مجھے ناریل کے درختوں میں آ کر بڑا سکون محسوس ہوا اور میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ ناریل کے درخت مجھے سگریٹ سلگاتا دیکھ کر ہنس پڑے۔

ڈھاکے میں ہماری مصروفیت بہت زیادہ تھیں۔ پھر بھی میں اور اشفاق احمد وقت نکال کر محمد پور چلے جایا کرتے تھے۔ وہاں میرے رشتے میں بھائی شاہد رشید بٹ' فاروق بٹ اور ذوالفقار بٹ کا قالینوں کا شو روم تھا۔ وہاں ہمیں گھر کی بنی ہوئی کشمیری سبز چائے بھی ملتی تھی۔

ایک روز میں اور اشفاق احمد ذوالفقار بٹ کی گاڑی میں بیٹھ کر شمال

مشرق کی جانب شہر سے بہت دور نکل گئے۔ یہ بڑے امن امان کا زمانہ تھا۔ ڈھاکہ سے کوئی تیس چالیس میل دور سنبل کے گھنے درختوں میں شاہد بٹ نے ایک چھوٹا سا کاٹج بنوایا ہوا تھا جہاں وہ اپنی فیملی کے ساتھ پک نک منانے چلا جاتا تھا۔ یہ لکڑی کا بڑا خوبصورت کاٹج تھا۔ آگے برآمدہ تھا۔ زمین سے کوئی چار فٹ بلند بانس کے بڑے بڑے ستونوں کے اوپر یہ کاٹج تعمیر ہوا تھا۔ ہم ان کے نیچے سے جھک کر گذر جاتے تھے۔ ایک جانب کیلے کے درخت تھے۔ چھوٹی سی کھیتی میں اناس لگے تھے۔ ہم نے سارا دن وہاں گذارا۔ شام کو واپس آئے۔ اشفاق کو وہ جگہ بڑی پسند آئی۔ کہنے لگا۔

"ایسا ایک کاٹج ہمیں بھی لاہور کے شور ہنگامے سے دور بنانا چاہیے۔"

میں نے کہا۔

"میں زمین پر تو ایسا کاٹج نہیں بنا سکتا۔ مگر ایسا ہی ایک کاٹج میں نے اپنے اندر بنایا ہوا ہے۔ جب دل چاہتا ہے اسی کے برآمدے میں سنبل کے درختوں کے پاس سگریٹ سلگا کر بیٹھ جاتا ہوں۔"

اشفاق ہنس کر کہنے لگا۔

"تم ہر وقت رومانٹک باتیں نہ کیا کرو بچو! حقیقی زندگی کی گرم لو چلی تو تمہارے کاٹج کے سارے پھول مرجھا جائیں گے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"یہی تو اس کاٹج کی خوبصورتی ہے کہ وہاں کبھی لو نہیں چلتی اور اس کے پھول کبھی نہیں مرجھاتے۔"

لیکن یہ تو تصوراتی باتیں ہیں۔ اشفاق ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مگر اسے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ میں حقیقت کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہوں۔ بلکہ اس سے زیادہ حقیقت کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ جتنی گرم لو میں نے دیکھی ہے اس نے نہیں دیکھی۔

بہرحال ذوالفقار بٹ کے سنبل اور کیلے کے درختوں والے کاٹج میں کچھ وقت گذار کر اسے بڑی خوشی حاصل ہوئی تھی اور میں یہی چاہتا تھا۔ اب ہمارا مشرقی پاکستان کا سفر شروع ہو گیا۔ اس کو جمہوریت کے سفر کا نام دیا گیا تھا۔ نہ تو مجھے جمہوریت سے دلچسپی تھی اور نہ میں اس کے مفہوم سے واقف تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں دوستوں کے ساتھ جنوب مشرقی فضاؤں میں سفر کر رہا ہوں۔ میرے لئے یہی سب سے بڑی جمہوریت تھی۔ کئی روز تک یہ جمہوری ٹرین چلتی رہی۔ مشرقی پاکستان کے سارے اہم شہر دیکھے۔ دریاؤں پر سے گذرے۔ جنگلوں میں سے گذرے جہاں دیودار کے درختوں کی ٹھنڈی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ رانگا متی کے پہاڑی ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں کھڑے ہو کر دوسری طرف نیچے بہتے کرنا فلی دریا کو دیکھا۔ دریا پار سندر بن کے جنگل کی جھلک دیکھی۔ اس جنگل میں زرد دھاری دار شیر پائے جاتے ہیں۔ انہیں بنگال ٹائیگر کہا جاتا ہے۔

سلہٹ میں ہم چائے کے باغوں میں گئے۔ پہاڑی ڈھلانوں پر چائے کے سرسبز پودے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ آگے دور نیچے تک چلے گئے تھے۔ کہیں کہیں عورتیں چائے کی پتیاں چنتی نظر آ رہی تھیں۔ یہاں باغ کے منیجر نے مجھے چائے کا ایک پیکٹ دیا۔ کہنے لگا۔

"یہ خاص چائے ہے۔ اس میں رنگ نہیں ملایا گیا اور اسے Blend بھی نہیں کیا گیا۔ یہ بالکل اصلی چائے ہے اور ہم یہ چائے خاص خاص مہمانوں اور چائے کے شوقین لوگوں کو دیتے ہیں۔"

سلہٹ میں ہم ایک کارخانہ دار سیٹھ کی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اشفاق تو کسی دوسری جگہ پر ٹھہرا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"شام کی چائے تم میرے ساتھ ہی پینا۔ میں یہ خاص چائے تمہارے ساتھ پینا چاہتا ہوں۔"

ہم تھوڑی دیر سلہٹ ریلوے سٹیشن پر اپنی جمہوریت ٹرین میں رہے۔

پھر میں اشفاق کو لے کر اس کوٹھی میں آگیا جہاں مجھے اور ابن انشاء کو ایک چھوٹا سا بیڈ روم دے دیا گیا تھا۔ میں نے نوکر سے کہہ کر کیتلی منگوائی' پیالیاں منگوائیں۔ پھر اسے گرم پانی لانے کو کہا۔ میں نے پیکٹ کھول کر چائے کی خوشبو سونگھی۔ یہ عجیب سرسبز قسم کی خوشبو تھی۔ میں نے چائے کے دو چمچ کیتلی میں ڈال دیئے۔ نوکر گرم پانی لایا تو اس میں گرم پانی ڈال کر ٹی کوزی سے بند کر دیا۔ پورے دس منٹ بعد کیتلی میں سے چائے پیالیوں میں ڈالی تو ایسا معلوم ہوا جیسے طلوع ہوتے سورج کی کرنوں نے چائے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ہم دونوں نے بڑے اہتمام سے اس کا ایک ایک گھونٹ پی کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

اشفاق نے بھنوئیں سکیڑ کر کہا۔

"یہ چائے میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

چائے میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ مگر آخر وہ چائے تھی اور اصلی چائے تھی۔ دراصل ہمیں انگریزوں نے Blend کی ہوئی چائے کی عادت ڈال دی تھی۔ ہمارا چائے کا مزاج انگریزوں کا بنایا ہوا ہے۔ بہرحال مجھے اس چائے میں کم از کم چائے کے باغوں کی مہک ضرور مل گئی تھی۔

ہماری لاہور واپسی کی تیاریاں شروع ہو گئیں تھیں کہ مشرقی پاکستان کے شاعر جسیم الدین نے تمام ادیبوں' شاعروں اور دانشوروں کو اپنے ہاں دعوت پر بلالیا۔ قوی جسیم الدین کے گھر کے آگے ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں ایک کشتی نہ جانے کب سے اوندھی پڑی تھی۔ مکان کے دروازے پر ایک چھوٹی معصوم بچی چنبیلی کے پھولوں سے بھری ہوئی چنگیر لئے کھڑی تھی۔ وہ ہر مہمان کا استقبال چنبیلی کا ہار اس کے گلے میں ڈال کر کرتی۔ ہمیں یہ معصوم استقبال بڑا اچھا لگا۔ قوی جسیم الدین بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہر مہمان سے مصافحہ کر رہا تھا۔ کھانے میں اس نے بنگال کی خاص ڈش دال بھات اور کھیر

پکائی تھی جو بے حد لذیذ تھی۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا اور پھر گانے بجانے کی محفل شروع ہو گئی۔ جسیم الدین نے ایک سکول کے میوزیکل گروپ کو بلایا ہوا تھا۔ ان میں ایک دسویں جماعت کی ایک لڑکی بھی تھی جس کا نام جھرنا تھا۔ یہ لڑکی بعد میں شبنم کے نام سے بطور فلم ایکٹریس بڑی مشہور ہوئی۔ اس وقت یہ لڑکی تھی اور اس نے بڑے کمال کا رقص کیا۔

کافی دیر تک گانے بجانے کی یہ محفل جاری رہی۔ پھر ہم لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر آگئے۔ اس سے اگلے روز ڈھاکے میں ہماری مصروفیات ختم ہو گئیں۔ اور ہماری واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ میں اور ابن انشاء ایک ہی جہاز میں ڈھاکہ سے کراچی پہنچے۔ وہ کراچی میں ہی رک گیا۔ میں دوسرے روز لاہور پہنچ گیا۔

اب میں آپ کو اشفاق احمد کا ایک اور واقعہ سناتا ہوں۔ یہ وہ واقعہ ہے جسے میں نے آج تک نہ تو کسی کو بتایا ہے اور نہ اس کا ذکر کسی کتاب میں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اشفاق نے مجھے منع کر رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس واقعے کی تشہیر ہو۔ اس نے ایک نیکی کی تھی اور اسے دریا میں ڈال دیا تھا۔ آج میں یہ واقعہ دریا میں سے نکال کر آپ کے لئے یہاں قلم بند کر رہا ہوں۔ یقین کریں اس کے لئے میں نے اشفاق سے کوئی اجازت نہیں لی۔ وہ اگر مجھ سے ناراض ہو گا تو میں اسے سنبھال لوں گا۔

رائل پارک میں ایک فلم کمپنی کا دفتر ہوا کرتا تھا جس کا ایک تہہ خانہ بھی تھا۔ رات کو اس تہہ خانے میں بیٹھ کر کچھ دوست پیا پلایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی اس محفل میں شریک ہو جاتا تھا۔ یہ سب آپس میں بے تکلف دوست تھے اور تقریباً سب کا تعلق فلم اور آرٹ کی دنیا سے تھا اور سب پختہ عمر کے ذمے دار لوگ تھے۔ ان کی تفریح صرف اتنی تھی کہ دن بھر کی دوڑ دھوپ کی تھکان اتارنے کے لئے مل بیٹھتے اور مے گلفام کا لطف اٹھاتے۔ یہاں کبھی کوئی ہنگامہ نہیں ہوا تھا۔ کبھی دھکا چوکڑی نہیں مچی تھی جو اس قسم

کے ماحول کا تقاضا تھا۔ زیادہ تر یہ لوگ فلموں یا فلم کی کہانیوں اور آرٹ کی باتیں کرتے۔ اگر کسی کو زیادہ چڑھ جاتی تو وہ اجازت لے کر وہاں سے چل دیتا۔ کسی غیر آدمی کو وہاں آنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ ایک رات ایسا ہوا کہ اس منڈلی میں بیٹھنے والا ایک آدمی اپنے کسی دوست کو ساتھ لے آیا۔ اس دوست کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ اس نے یہی بتایا کہ یہ لڑکی کراچی میں ماڈلنگ کرتی ہے اور اس کے ساتھ وہ شادی کرنے والا ہے۔ سب کا موڈ آف ہوگیا۔ کیونکہ وہاں کبھی کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ بہرحال محفل شروع ہوگئی۔

لڑکی نے نسواری برقعہ پہن رکھا تھا۔ چہرے کا نقاب ہٹا ہوا تھا۔ سانولی سی معمولی شکل و صورت کی لڑکی تھی اور وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ آہستہ آہستہ محفل گرم ہوتی گئی۔ باتوں میں گرمجوشی آگئی۔ جو آدمی لڑکی کو ساتھ لایا تھا اس نے لڑکی کے ساتھ بے تکلف ہونا شروع کر دیا۔ لڑکی بار بار سمٹ جاتی تھی۔ جس آدمی کا وہ دفتر تھا اس کو یہ بات سخت ناگوار لگی۔ اس نے کہا۔

"بھائی جان! یہ ٹھیک ہے کہ یہ آپ کی منگیتر ہے مگر میں آپ کو یہاں اس قسم کی حرکتوں کی اجازت نہیں دوں گا۔"

جو آدمی اس شخص کو اپنے ساتھ لایا تھا اس نے فوراً اپنی طرف سے معذرت پیش کی اور اپنے دوست سے کہا۔

"یار! تم اپنی ہونے والی بیوی کو لے کر ساتھ والے کمرے میں چلے جاؤ۔ جاؤ۔"

وہ شخص فوراً لڑکی کو بازو سے کھینچتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دوسرے کمرے سے لڑکی کے چیخنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

"مجھے بچاؤ' مجھے بچاؤ' یہ مجھے مار دے گا۔"

ہم بھاگ کر دوسرے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ اس آدمی نے لڑکی کو زمین پر گرایا ہوا ہے۔ ہاتھ میں چاقو ہے اور اسے قتل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سب نے فوراً آدمی کو قابو کر کے اس کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا۔ لڑکی کے حواس گم تھے۔ وہ کونے میں سمٹی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ وہ شخص بار بار کہہ رہا تھا۔

"تم کون ہوتے ہو ہمارے معاملے میں دخل دینے والے۔ چھوڑ دو مجھے۔ میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں پورے پانچ سو روپے دے کر اسے لایا ہوں۔ یہ کیا سمجھتی ہے——"

اس شخص کی سب نے ٹھکائی کی۔ دفتر کے مالک نے اسے حکم دیا۔

"ابھی یہاں سے نکل جاؤ نہیں تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

"میں اس عورت کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

لڑکی نے چیخ کر کہا۔

"خدا کے لئے مجھے اس کے ساتھ نہ بھیجیں۔ یہ مجھے قتل کر دے گا۔"

اس محفل میں بیٹھنے والے جس شخص کے توسط سے وہ آدمی وہاں لڑکی کو لے کر آیا تھا۔ اس نے پوری طاقت سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور گالی دے کر کہا۔

"بندے کے پتر ہو تو اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔ نہیں تو میں خود تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ نکل جاؤ یہاں سے۔"

وہ آدمی بڑبڑ کرتا دھمکیاں دیتا وہاں سے چلا گیا۔ لڑکی اس کمرے میں سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ سب کا نشہ ہرن ہوگیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب اس لڑکی کا کیا کیا جائے۔ یہ لوگ کاروباری قسم کے شریف لوگ تھے۔ سب گھر بار والے تھے۔ رات کو محض تھوڑی سی تفریح کے لئے وہاں بیٹھ جاتے تھے۔

سب کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ لڑکی کا کیا کریں؟ لڑکی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میرا یہاں کوئی نہیں ہے۔ یہ شخص مجھے چنڈی کے ایک گاؤں سے بہلا پھسلا کر لے آیا تھا۔ میں اس کے بہکانے میں آگئی۔ کسی نے کہا۔

"اسے پولیس کے حوالے کر دو۔ وہ اسے خود اس کے گاؤں پہنچا دے گی۔"

کسی نے کہا۔

"یہ غلطی مت کرنا۔ اگر لڑکی جیسا کہ وہ کہہ رہی ہے اگر کسی شریف گھرانے کی ہے تو تھانے گئی تو داغ لگ جائے گا۔"

"تو پھر اسے کہاں پہنچایا جائے؟"

سب کے ذہن میں یہی ایک سوال تھا۔ کوئی بھی اسے اپنے ساتھ گھر لے جانے اور پھر اس کے گاؤں پہنچانے پر تیار نہیں تھا۔ سب بال بچے دار تھے اور پھر یہ بھی خیال تھا کہ ہوسکتا ہے لڑکی جھوٹ بول رہی ہو۔ یہ کوئی پیشہ ور آوارہ عورت ہو۔ خواہ مخواہ کی بدنامی مول لینے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ میں ان میں سب سے چھوٹا تھا۔ اگرچہ میری دو سال پہلے شادی ہوچکی تھی۔ میں نے دفتر کے مالک سے کہا۔

"اس کو میں اپنے گھر لے جاتا ہوں۔ صبح اسے لے کر اس کے گاؤں چلا جاؤں گا۔"

سب کے ذہن سے جیسے بوجھ سا اتر گیا۔ سب فوراً راضی ہوگئے۔ یہ ٹھیک ہے۔ بس تم اسے اپنے گھر لے جاؤ۔ اپنی طرف سے ہر کوئی اس لڑکی کی بلا میرے سر ڈالنا چاہتا تھا۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہے؟ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"چلی چلوں گی۔ مگر خدا کے واسطے مجھے میرے گھر ضرور پہنچا دینا۔"

مجھے بھی تھوڑی تھوڑی چڑھی ہوئی تھی۔ تہہ خانے کی گرما گرمی اور

جذبات میں آ کر میں نے لڑکی کی ذمہ داری تو قبول کرلی تھی لیکن جب آدھی رات کے وقت اسے لے کر تہہ خانے سے باہر نکلا اور باہر کی ٹھنڈی ہوا لگی تو کچھ ہوش آگیا اور میں سوچنے لگا کہ یہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ اس لڑکی کو گھر لے کر گیا تو بیوی کیا کہے گی؟ اور اوپر سے میں نے تھوڑی پی بھی رکھی ہے۔ عام طور پر میں نشہ ہرن ہونے کے بعد گھر کا رخ کرتا تھا۔ تاکہ گھر میں کسی کو پتہ نہ چلے اور گھر میں آتے ہی سو جایا کرتا تھا۔

دل میں یہ خیال بھی بار بار آتا کہ ہوسکتا ہے لڑکی جھوٹ بول رہی ہو اور اس کا تعلق کسی پیشہ ور گروہ سے ہو۔ سردیوں کا موسم تھا' رائل پارک کا علاقہ سنسان تھا۔ میں نے لڑکی کو ایک جگہ کھڑا کیا اور کہا۔

"دیکھو بی بی! میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں لیکن میں عورت کی عزت کی قیمت کو جانتا ہوں۔ مجھے سچ سچ بتا دو کہ تم اصل میں کہاں سے آئی ہو اور اس آدمی کے ساتھ تمہارا کیا تعلق تھا۔"

لڑکی رونے لگی۔

"مجھ سے قسم لے لو۔ میں غریب لڑکی ہوں میں کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ یہ آدمی مجھے دھوکے سے لے آیا ہے۔ تم مجھے اپنے گھر لے چلو۔ میں تمہیں سارا قصہ سنا دوں گی۔ خدا کے واسطے مجھے تھانے مت لے جانا۔ میرے بوڑھے باپ کو پتہ چلا تو وہ وہیں مر جائے گا اسے پہلے ہی فالج ہوا ہوا ہے۔"

تب میں نے سوچا کہ اب اس لڑکی کا ہاتھ پکڑا ہے تو اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔ لڑکی پر اعتبار کرو اور آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں بڑا جذباتی ہوگیا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آؤ' میرے ساتھ۔"

میں نے اسے ساتھ لے کر لکشمی چوک میں آگیا۔ اس زمانے میں رکشا وغیرہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ ٹیکسی بھی بڑی مشکل سے نظر آتی تھی۔ میں نے

تانگہ لیا اور اسے ساتھ بٹھا کر اپنے گھر کی طرف جانے کی بجائے اشفاق کے گھر کی طرف چل پڑا۔ یہ خیال اچانک میرے دماغ میں آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اشفاق اس سلسلے میں ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔ میں نے اس کا ایک خالی گیراج دیکھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ لڑکی کو رات اس گیراج میں سلا دیں گے۔ آدھی رات گذر چکی تھی۔ میکلوڈ روڈ خالی خالی تھی۔ تانگہ اشفاق کے پہلے والے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔

آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ میں نے تانگے کو ذرا پیچھے ایک درخت کے نیچے کھڑا کیا اور اتر کر اشفاق احمد کے گھر کی طرف بڑھا۔ اس کے برآمدے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اندر کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ کافی دیر بعد نوکر نے دروازہ کھولا۔ اس نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے اشفاق کا پوچھا۔ اس نے کہا۔ "جی وہ سو رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "انہیں جگا دو اور میرا نام بتاؤ۔"

نوکر چلا گیا۔ چھ سات منٹ گذر گئے۔ دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ اس بار اشفاق گرم چادر کی بکل مارے باہر آیا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

"خیر تو ہے۔ تم اس وقت؟"

میں نے کہا۔

"ادھر آجاؤ۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

میں اسے مکان کی دیوار کے پاس لے گیا اور جلدی جلدی سارا قصہ کہانی بیان کر دی۔ اشفاق غور سے سنتا رہا۔ جب میں نے بات ختم کی تو وہ بولا۔

"تم بڑے احمق ہو۔ خوامخواہ مجھے بھی کسی مصیبت میں پھنساؤ گے۔ اس لڑکی کو سیدھا تھانے لے جاؤ اور پولیس کے حوالے کرکے اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔"

میں نے کہا۔

"اشفاق میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ لڑکی شریف ہے۔ میں نے بہت پیشہ ور عورتیں دیکھی ہوئی ہیں۔ میں ان کی چال پہچان لیتا ہوں۔ یہ لڑکی ایسی نہیں ہے۔ اگر اس وقت ہم نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو کل یہ ضرور پیشہ ور عورت بن جائے گی۔ قدرت شاید اسی لئے اسے ہمارے پاس لے آئی ہے کہ وہ اسے گناہ کی دلدل میں گرنے سے بچانا چاہتی ہے۔"

اشفاق پر کچھ میری باتوں کا اثر ہوا اور کچھ اس کی فطری انسانی ہمدردی اور رحم دلی بیدار ہو گئی۔ کہنے لگا۔

"تو پھر تم کیا مشورہ دیتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میرا پروگرام یہ ہے کہ لڑکی کو رات تمہارے مکان کے گیراج میں سلا دیتے ہیں۔ صبح اسے لے کر پنڈی روانہ ہو جائیں گے اور جس کی یہ امانت ہے اس کے حوالے کرکے واپس آجائیں گے۔ لیکن تمہیں میرے ساتھ ضرور چلنا ہوگا۔ کیونکہ تم مدبر آدمی لگتے ہو اور تم بڑی اچھی طرح بات کر لیتے ہو۔"

اشفاق ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا۔ لڑکی کو تانگے میں سے اتار کر لے آیا۔ اشفاق نے برآمدے والے بلب کی روشنی میں لڑکی کے ویران ویران چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ اندر چلا گیا۔ لڑکی پریشان تھی۔ مجھ سے کہنے لگی۔

"آپ مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں گے نا؟ میں ساری عمر آپ کو دعائیں دیتی رہوں گی۔"

میں نے اسے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ رات تم اس جگہ آرام سے سو جاؤ۔ صبح میں اور میرا دوست ہم دونوں تمہیں بس میں بٹھا کر تمہارے گھر چھوڑ آئیں گے۔"

اشفاق نے اندر سے گیراج کا دروازہ کھول دیا۔ گیراج میں ایک چارپائی پہلے سے بچھی ہوئی تھی۔ ابھی اشفاق کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ ہم نے لڑکی کو چارپائی پر آرام کرنے کے لئے کہا اور خود باہر آ گئے۔ اشفاق کہنے لگا۔

"تم اس وقت کہاں گھر جاؤ گے۔ تم بھی یہاں ڈرائینگ روم میں سو جاؤ۔ میں تمہیں کمبل لا دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں بھی یہیں سو جاتا ہوں۔ صبح تمہارے نوکر کے ہاتھ گھر پیغام بھجوا دوں گا کہ مجھے ضروری کام سے اچانک شہر سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔"

میں نے بھی رات اشفاق کے گھر میں گذار دی۔

صبح اٹھ کر ہم نے ناشتہ کیا۔ لڑکی کو بھی ناشتہ کرایا اور پھر میں اور اشفاق اسے لے کر پنڈی جانے والی بسوں کے اڈے پر آ گئے۔ یہاں سے جو پہلی بس ملی اس میں بیٹھے اور بس اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ بس راولپنڈی پہنچی تو شام گہری ہونے لگی تھی۔ دن ڈوب چکا تھا۔ لڑکی نے اپنا نام شمیم بتایا تھا۔ شمیم کا گاؤں وہاں سے پچاس میل دور تھا۔ بس اڈے پر ہم نے چائے وغیرہ پی اور پھر دوسری بس پکڑ کر شمیم کے گاؤں کی طرف چل پڑے۔

سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ سرد ہوا چلنے لگی تھی۔ کچی سڑک تھی۔ بس کی رفتار کم تھی۔ دو گھنٹے ہمیں وہاں پہنچتے ہوئے لگ گئے۔ شمیم نے بس سے اترتے ہی ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ان درختوں کے پاس ہمارا گاؤں ہے۔"

شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ ایک پگ ڈنڈی کھیتوں میں سے گذرتی ان درختوں کی طرف چلی گئی تھی۔ جن کی طرف لڑکی نے اشارہ کیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے پگ ڈنڈی پر چل رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ لڑکی کچھ گھبرائی گھبرائی سی ہے اور مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے

اس سے پوچھ ہی لیا کہ کیا بات ہے۔ اب تم کیوں پریشان ہو؟ اب تو ہم تمہیں تمہارے گھر لے آئے ہیں۔ لڑکی رک گئی۔ اشفاق بھی رک گیا۔

لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مجھے معاف کر دینا۔ میں نے یہ بات تمہیں پہلے نہیں بتائی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم مجھے میری حالت پر نہ چھوڑ دو۔"

"کیا بات ہے؟ کھل کر بتاؤ۔" اشفاق نے لڑکی سے کہا۔

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ کہنے لگی۔

"میری ماں بچپن میں ہی مر گئی تھی۔ میرے باپ کو فالج ہو گیا ہوا ہے۔ وہ بستر پر سے ہل بھی نہیں سکتا۔ میرے باپ کا ایک سوتیلا بھائی ہے۔ وہ گاؤں کا بدمعاش ہے۔ شراب بنا کر بیچتا ہے۔ وہ مجھ سے ناجائز دھندا کرانا چاہتا ہے۔ اسی نے مجھے اس آدمی کے ہاتھ پانچ سو روپے لے کر بیچا تھا مگر وہ آدمی مجھے بہلا پھسلا کر لاہور لے گیا۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

لڑکی بولی۔

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرے باپ کا سوتیلا بھائی یہاں کا بدمعاش ہے۔ وہ دو قتل بھی کر چکا ہے۔ اسے پتہ چل گیا کہ میں آ گئی ہوں تو وہ مجھے گھر سے زبردستی اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لے جائے گا۔ میرا بیمار باپ تو اس کا ہاتھ بھی نہ پکڑ سکے گا۔ تم دونوں میرے لئے فرشتے بن کر اترے ہو۔ تم نے میری عزت بچائی ہے تو اب مجھے اس بدمعاش سے بھی کسی طرح بچا لو۔ نہیں تو میری ساری زندگی برباد ہو جائے گی۔"

اشفاق نے کہا۔

"بی بی! یہ تمہارے گھریلو جھگڑے ہیں ہم اس میں دخل نہیں دینا

چاہتے۔ ہمارا کام تمہیں گناہ کی زندگی سے بچا کر تمہارے باپ کے
پاس پہنچانا تھا۔ سو ہم نے پہنچا دیا۔
لڑکی نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔
"خدا کے لئے مجھے اس بدمعاش سے بچاؤ۔"
"ہم کیا کر سکتے ہیں؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔
لڑکی بولی۔
"تم میری شادی کرم داد سے کروا دو۔ بس پھر وہ بدمعاش میرا کچھ
نہیں بگاڑ سکے گا۔"
"یہ کرم داد کون ہے؟" اشفاق نے پوچھا۔
"ہماری برادری کا ہے۔ پنڈی میں رکشا چلاتا ہے۔ ہم ایک
دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔ ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس
بدمعاش نے کرم داد کو کہہ رکھا ہے کہ اگر تم نے شمیم سے شادی
کا نام لیا تو تمہارے ٹوٹے کروا دیئے جائیں گے۔"
اشفاق بولا۔ "تو وہ تو اس کے ٹوٹے کروا دے گا۔"
لڑکی نے اشفاق کا بازو پکڑ لیا۔
"مرد بن کر مجھے یہاں میرے باپ کے پاس لائے ہو۔ اب کرم داد
سے میرا بیاہ بھی کرا دو۔ آگے جو ہو گا میں دیکھ لوں گی۔ تمہارے
پاس مدد مانگنے نہیں آؤں گی۔"
اشفاق کا چہرہ تانبے کی طرح روشن ہو گیا۔ دو تین سیکنڈ وہ چپ رہا۔ پھر
گہری آواز میں بولا۔
"ٹھیک ہے۔ اگر تیرا باپ اس بیاہ پر راضی ہے تو میں اور میرا
دوست ہم دونوں تیرے ساتھ ہیں اور یہاں سے تیرا بیاہ کروا کر ہی
واپس جائیں گے۔"
لڑکی کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"بہادر مائی کے لال ہو۔ آؤ میرے باپ سے ملو۔"
اس کا باپ بوسیدہ سے کوارٹر نما مکان کے کمرے کے کونے میں لحاف
گردن تک کئے بالکل سیدھا پڑا تھا۔ وہ صرف گردن ہلا سکتا تھا۔ اپنی بیٹی کو
دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لڑکی نے باپ کا ماتھا چوم لیا اور اس
سے شروع سے لے کر آخر تک ساری داستان بیان کر دی۔ ہم نے اس کے
باپ سے پوچھا کہ کیا وہ اپنی بیٹی کا بیاہ کرم داد سے کرنے پر راضی ہے؟ باپ
نے نحیف آواز میں کہا۔
"میں راضی میرا خدا راضی۔"

○

شمیم کے باپ کا جو بدمعاش ٹائپ کا سوتیلا بھائی تھا اس کا نام تو کچھ اور تھا آپ اسے کالیا کہہ لیں۔ شمیم کے باپ نے بھی اس خدشے کا اظہار کیا کہ کالیا اس کی بیٹی اور کرم داد کی جان لے لے گا۔ اشفاق نے کہا۔

"ہم اسے سنبھال لیں گے۔ آپ کرم داد کو بلائیں۔ مولوی صاحب کو بلوائیں۔ اپنے دو ایک بزرگ محلے داروں کو بلائیں اور لڑکی کا نکاح پڑھا کر رخصت کریں۔"

اشفاق کی باتوں سے شمیم کے باپ کو حوصلہ ہو گیا۔ رات ہم نے اسی کوارٹر میں بسر کی۔ دوسرے دن شمیم نے اپنے ایک ماموں کو بلوا لیا۔ ماموں نے سارا بندوبست کر دیا۔ ابھی تک کالیے بدمعاش کو خبر نہیں ہوئی تھی۔ دوپہر کو شمیم کا نکاح کرم داد کے ساتھ ہو گیا اور اس نے اسی گھر میں اپنے خاوند کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ کرم داد نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ کرم داد بڑا دلیر نوجوان ثابت ہوا۔ اسی نے لڑکی کے باپ سے کہا۔

"ابا! تم بالکل نہ گھبراؤ۔ کالیے کی جرات نہیں ہے کہ وہ ہمارا کچھ بگاڑ سکے۔ میں نے بھی چوڑیاں نہیں پہنی ہوئیں۔"

لیکن یہ لڑائی جھگڑے کی بات تھی اور وہاں خون خرابے کا شدید خطرہ تھا۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

"ہمیں دونوں میاں بیوی کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کرنا چاہیے۔"

اشفاق کہنے لگا۔

"میں ایسا انتظام کر کے جاؤں گا کہ کالیا روز یہاں آ کر شمیم سے پوچھا کرے گا۔ باجی! کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ اشفاق ایسا کر سکتا ہے۔ افسران بالا میں اس کا کافی اثر و رسوخ تھا۔ وہاں گاؤں میں ایک چھوٹا سا پوسٹ آفس تھا۔ اشفاق مجھے ساتھ لے کر پوسٹ آفس آ گیا۔ یہاں ایک ٹیلی فون موجود تھا۔ اشفاق نے پوسٹ ماسٹر کی اجازت سے پنڈی پولیس ہیڈ کوارٹر میں کسی خان صاحب کو فون کیا۔ خوش قسمتی سے وہ مل گئے۔ اشفاق نے کہا۔

"کیا حال ہے یار؟ میں اشفاق احمد بول رہا ہوں۔ نہیں نہیں۔ میں لاہور سے نہیں پنڈی سے بول رہا ہوں۔"

پھر اشفاق احمد نے اپنے دوست کو جو پولیس کا بڑا افسر تھا۔ اس گاؤں کا حدود اربعہ بتایا اور ساری کہانی بیان کر دی۔ پوسٹ ماسٹر رجسٹر پر لکھتے لکھتے اشفاق کی طرف دیکھنے لگا۔ اشفاق کہہ رہا تھا۔

"جتنی جلدی پہنچ سکتے ہو پہنچ جاؤ۔ میں یہاں پوسٹ آفس کے باہر تمہارا انتظار کرتا ہوں۔ بس آجاؤ۔ یہ بڑا نیک کام ہے۔"

اشفاق نے ہنستے ہوئے خدا حافظ کہا اور فون بند کر کے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے فوجی لہجے میں بولا۔

"پیارے! فکر نہیں۔ کمک آ رہی ہے۔"

ہمیں اندازہ تھا کہ پنڈی سے اشفاق کا دوست پولیس وین میں فل سپیڈ پر بھی آیا تو ایک گھنٹہ اسے ضرور لگ جائے گا۔ اتنی دیر ہم پوسٹ آفس کے باہر کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

"چلو! شمیم کے ہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔ اس کے خاوند اور باپ کو بھی تسلی دیتے ہیں۔"

ہم شمیم کے گھر آ گئے۔ اشفاق نے ساری بات بیان کی اور کہا کہ انھیں کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سارا بندوبست کر

دیا ہے۔ میرا دوست خان اس سارے علاقے کا انچارج ہے وہ تمہارے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونے دے گا۔ تم لوگ امن چین سے زندگی گزارو گے۔ کرم داد اور شمیم اور اس کا باپ بڑے خوش ہوئے۔

اس دوران کالیے بدمعاش کو خبر مل گئی تھی کہ شمیم کا کرم داد سے نکاح ہوگیا ہے۔ ہم لوگ شمیم کے گھر میں ہی بیٹھے تھے کہ وہ اپنے چھ سات بدمعاشوں کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ آتے ہی اس نے پستول سے دو تین ہوائی فائر کردیئے۔ کرم داد جوش میں آ کر بولا۔

"یہ کالیا ہی ہوسکتا ہے۔ ابھی جا کر میں اس کی بدمعاشی نکالتا ہوں۔"

اشفاق نے اور شمیم نے اسے پکڑ لیا۔

"کرم داد! بیوقوفی مت کرو۔ امن چین سے یہاں بیٹھے رہو۔ دیکھتے ہیں وہ کیا کرتا ہے۔"

کالیے بدمعاش نے باہر سے للکارنا شروع کردیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ اس کے ساتھی باہر ہی حکم کے منتظر کھڑے رہے۔ یہ کالیا گٹھے ہوئے جسم کا آدمی تھا۔ شکل ہی سے جرائم پیشہ لگتا تھا۔ اس نے میری اور اشفاق کی طرف دیکھا اور بولا۔

"تم لوگ اس کے حمایتی بن کے آئے ہو۔ میں تم سے بھی نمٹ لوں گا۔ پہلے اس بڈھے کی تو خبر لے لوں۔"

کرم داد کھڑا ہوگیا اور کڑک کر بولا۔

"کالیے! خدا کا خوف کر۔ اگر تونے کسی کو ہاتھ لگایا تو یاد رکھ یہاں سے تو بھی زندہ بچ کر نہیں جائے گا۔"

کالیے نے دانت پیس کر کہا۔

"تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔"

اب اشفاق بیچ میں آگیا۔ اس نے بڑی عقل مندی اور موقع شناسی سے

کام لیتے ہوئے کالیے کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے۔ کرم داد اور شمیم میاں بیوی ہیں اگر اس نے کوئی ایسی ویسی بات کی تو قانون کے شکنجے سے نہیں بچ سکے گا۔ ساتھ ساتھ اشفاق احمد کالیے کو نرم لہجے میں سمجھاتا بھی جا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ وقت گذار رہا ہے تاکہ اتنی دیر میں اس کا پولیس افسر دوست وہاں پہنچ جائے۔

اتنی دیر میں اشفاق کا پولیس انسپکٹر دوست پولیس کی پوری گارد لے کر پوسٹ آفس پہنچ گیا۔ اس نے اشفاق کو وہاں نہ دیکھا تو پوسٹ ماسٹر سے پوچھا۔ پوسٹ ماسٹر نے کہا کہ وہ گاؤں کی طرف سے آئے تھے۔ اس دوران کالیے کے ساتھیوں نے جو مکان کے باہر کھڑے تھے اشتعال میں آ کر ہوائی فائرنگ شروع کردی۔ اب پولیس کو کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پولیس انسپکٹر نے پستول نکال لیا اور جس طرف فائرنگ ہو رہی تھی ادھر کو پولیس کی گارد لے کر دوڑا۔ اشفاق نے باہر گاڑی رکنے کی آواز سنی تو جلدی سے باہر نکل آیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ باہر پولیس کی پوری مسلح گارد نے کالیے کے ساتھی بدمعاشوں سے ہتھیار رکھوا کر انہیں حراست میں لے لیا تھا۔ اشفاق کا دوست بولا۔

"کہاں ہے ان کا سرغنہ"

اشفاق نے انتہائی دانشمندی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"وہ ٹھیک ہوگیا ہے۔ اسے کچھ نہ کہنا۔"

مگر پولیس مکان کے اندر آگئی۔ کیونکہ کالیا پستول لئے کمرے میں موجود تھا اور پولیس نے اسے دیکھ لیا تھا۔ پولیس انسپکٹر نے کالیے سے کہا۔

"پستول مجھے دے دو۔"

اور آگے بڑھ کر اس نے کالیے کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ پھر اسے دھکا دے کر کمرے سے باہر گرا دیا اور پولیس سے کہا۔

"لے چلو اسے تھانے۔ اس کی بدمعاشی نکالتے ہیں۔"

اشفاق نے پولیس انسپکٹر کا شمیم کرم داد اور شمیم کے بیمار باپ سے
تعارف کروایا اور پوری تفصیل سے سارا قصہ سنایا۔ پولیس انسپکٹر نے جس کو
اشفاق خان کہ کر بلاتا تھا گھر والوں کو پوری تسلی دی اور کہا:
"میرے ہوتے ہوئے یہاں کوئی بدمعاش قانون کو اپنے ہاتھ میں
نہیں لے سکتا۔ آپ آرام سے رہیں۔ اپنا کاروبار کریں۔ میں ان
بدمعاشوں کو بالکل سیدھا کر دوں گا۔"
یہ بات میں یہاں بتانا بھول گیا ہوں کہ نکاح نامے پر لڑکی کی طرف سے
اشفاق احمد نے بطور وکیل دستخط کئے تھے۔ میں نے گواہ بن کر دستخط کئے۔
پولیس انسپکٹر کالیے اور اس کے ساتھی بدمعاشوں کو گرفتار کر کے لے
گئی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ شام ہونے سے پہلے پہلے وہاں سے لاہور کی طرف
روانہ ہو جائیں۔ مگر لڑکی نے کہا:
"بھائی جان! ابھی نہ جائیں میرا دل نہیں مانتا۔ آج کی رات رہ
جائیں میں آپ کا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔"
میں نے اشفاق سے کہا۔
"یار! جہاں ایک رات گزاری ہے۔ وہاں دوسری رات بھی گذار
دیتے ہیں۔ لڑکی کی تسلی ہو جائے گی۔"
ہم نے وہ رات بھی وہیں بسر کی۔ دوسرے دن ہم تنوری روٹی اور مکھن
کا ناشتہ کر کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ باہر گاڑی کی آواز آئی۔ اشفاق نے
دروازے کی طرف دیکھا اور کہا۔
"شاید میرا یار خان آیا ہے۔"
شمیم اور کرم داد دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ اتنے میں دروازے پر
کسی نے دستک دی۔ کرم داد نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر پولیس کے چار
سپاہی کالیے بدمعاش کو لئے کھڑے تھے۔ کالیے نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔
جیسے ہی دروازہ کھلا کالیا اندر آیا اور سیدھا لڑکی کے باپ کی چارپائی کی
طرف گیا اور اس کے پاؤں پر سر رکھ کر روتے ہوئے بولا۔
"بھائیا! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں بڑے دکھ پہنچائے ہیں۔
خدا کے واسطے مجھے معاف کر دو۔ میں اب بھی تمہیں دکھ نہیں
دوں گا۔"
اس کے بعد اس نے شمیم کی طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔
"بیٹی! تم بھی مجھے معاف کر دو۔ اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا تو خدا
بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔"
اسی طرح اس نے کرم داد سے بھی معافی مانگی اور اس کو اپنے گلے سے
لگالیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ کالیے بدمعاش کی ایک آنکھ تھوڑی سوجی ہوئی
تھی۔ اشفاق کے پولیس افسر دوست نے کالیے کو بالکل سیدھا کر دیا تھا۔ شمیم،
کرم داد اور اس کے سسر نے کالیے کو معاف کر دیا۔ کالیا پھر ہم سے معافیاں
مانگنے لگا۔ اس نے اشفاق کی طرف دیکھا اور بڑی عاجزی سے بولا۔
"میری ایک عرض ہے حضور! خان صاحب سے کہیں کہ وہ بھی مجھے
معاف کر دیں اور مجھے چنڈی تھانے میں نہ بلائیں۔"
اشفاق نے کہا:
"جب تم نے برائی سے توبہ کر لی ہے اور عہد کر لیا ہے کہ آئندہ تم
شریف آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرو گے تو پھر خان کو کیا ضرورت
ہے تمہیں تھانے بلانے کی؟"
کالیا گردن نفی میں ہلانے لگا۔
"حضور! آپ نہیں جانتے۔ آپ نہیں جانتے' خان صاحب سے کہ
کر تھانے سے میری جان بخشی کرا دیں۔ میں ساری زندگی آپ کا
غلام بن کر رہوں گا۔"
اشفاق ہنس پڑا۔
"فکر نہیں کرو۔ میں خان کو کہہ دوں گا۔ وہ تمہیں آئندہ تھانے

نہیں بلائے گا مگر تم بھی اپنے عہد پر قائم رہنا اور شریف بن کر رہنا۔"

کالیے بدمعاش نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور کہا۔

"میری توبہ' میرے باپ کی بھی توبہ۔ میں نے آج سے سب برے دھندے چھوڑ دیئے ہیں۔"

پھر وہ لڑکی کے باپ کی پائینتی کے پاس فرش پر بیٹھ گیا اور اس کے فالج زدہ پاؤں دبانے لگا۔

اسی روز میں اور اشفاق لاہور کے لئے واپس روانہ ہو گئے۔ گاؤں کے لاری اڈے پر چھوڑنے کرم داد' شمیم اور کالیا بدمعاش بھی آیا۔ اس نے سر پر حاجیوں والا زرد رومال باندھ رکھا تھا۔ اشفاق نے اور میں نے سب سے مصافحہ کیا۔ اشفاق نے شمیم اور کرم داد کو آپس میں محبت پیار سے رہنے کی تلقین کی اور ہم لاری میں بیٹھ گئے لاری ہمیں لے کر پنڈی کی طرف چل پڑی۔

میں نے اشفاق سے کہا۔

"اشفاق تم نے یہ بڑا زبردست نیک کام کیا ہے۔ میں بڑا متاثر ہوا ہوں۔"

اشفاق احمد شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"نہیں یار! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ تم نے کہا تو میں نے سوچا کہ ایک شریف بی بی کی زندگی سنور سکتی ہے۔ تو اس کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔"

میں نے کہا۔

"پھر بھی یار کون اپنے گھر کا عیش' آرام چھوڑ کر ایک غریب لڑکی کی خاطر سردیوں میں اتنا سفر کر کے آتا ہے اور جبکہ معاملہ بھی سنگین نوعیت کا ہو۔"

اشفاق بولا۔

"یار! ویسے کالیا بالکل سیدھا ہو گیا ہے۔ میرے یار خان نے اس کی بڑی کارگر ٹھکائی کی ہے۔ اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ان لوگوں سے ایسا ہی سلوک کیا جائے تو یہ راہ راست پر آتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"پھر بھی میں کہوں گا کہ کالیے کو خدا نے بھی سیدھی راہ دکھا دی ہے۔ ورنہ تھانوں میں تو بڑے بڑے بدمعاشوں کی ٹھکائی ہوتی ہے اور وہ ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں۔"

اشفاق اپنی بات پر زور دے کر کہنے لگا۔

"ہاں ——— یہی تو میں بھی کہا کرتا تھا کہ انسان کے دماغ میں تجویز اللہ میاں کی طرف سے آتی ہے۔ اگر خدا کی مرضی نہ ہو تو انسان لاکھ ہاتھ پاؤں مارے' کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خدا کی مرضی تھی کہ کالیا بدمعاشی اور جرائم کی دنیا کو چھوڑ کر شریفوں کی صف میں آ جائے۔ یہ واقعہ تو ایک بہانہ تھا۔ اب تم یقین رکھو۔ کالیا ساری زندگی نیک بنا رہے گا۔"

بس راولپنڈی کے مضافات میں داخل ہو گئی تھی۔ ہم بس سے اترے تو اشفاق کہنے لگا۔

"یار اپنے یار سے چل کر ملتے ہیں اور اس سے پوچھیں تو سہی کہ اس نے کونسا منتر پڑھ کر پھونکا تھا کہ کالیے بدمعاش کی کایا پلٹ گئی۔"

ہم وہاں سے ٹیکسی لے کر پولیس ہیڈ کوارٹر آ گئے۔ خان کے کمرے میں گئے تو وہ ہمیں دیکھ کر ہنس پڑا۔ اس نے اشفاق سے پوچھا۔

"کیوں پھر؟ ٹھیک ہو گیا نا بدمعاش! نکال دی نا ہم نے اس کی بدمعاشی۔"

ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اشفاق نے ہنس کر پوچھا۔

"یہ تو بتاؤ کہ تم نے کونسا منتر پھونکا تھا۔ وہ تو ساری بدمعاشی بھول گیا ہے۔"

خان ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

"پولیس والوں کے پاس بڑے منتر ہوتے ہیں اور چونکہ یہاں تم بیچ میں آگئے تھے اس لئے میں نے اپنا ایک خاص منتر استعمال کیا تھا۔ یہ منتر ایسا ہے کہ اگر چنگیز خان بھی ہمارے تھانے میں آجائے اور میں اس پر یہ منتر استعمال کروں تو وہ اپنی ساری تلوار بازیاں بھول جائے اور پولیس کو سارا حساب بتا دے کہ اس نے کتنے آدمیوں کو قتل کیا ہے اور کتنے بے گناہوں کی کھوپڑیوں کے مینار بنائے ہیں۔"

اشفاق نے اپنے دوست کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

"یہ تمہاری فرض شناسی اور نیک دلی ہے کہ تم ایک چھٹے ہوئے بدمعاش کو سیدھی راہ پر لے آئے ہو۔ اچھا یار! اب ہم چلتے ہیں۔"

خان نے کہا۔

"یار! پنڈی آئے ہو تو دو ایک دن میرے پاس بھی رک جاؤ۔ تم کب لاہور سے نکلتے ہو۔"

اشفاق نے کہا۔

"خان! تمہیں معلوم نہیں کہ میں پیچھے کتنے کام ادھورے چھوڑ کر آیا ہوں۔ اب مجھے اجازت دو۔ انشاء اللہ دوسری بار آیا تو ضرور تمہارے پاس ٹھہروں گا اور ہاں! لڑکی شمیم اور اس کے خاوند کا خیال رکھنا۔ ویسے مجھے پورا یقین ہے کہ کالیا کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گا۔"

خان نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"اس کی تو تم فکر ہی نہ کرو۔ میں نے اسے ایسا سیدھا کیا ہے کہ پھر کبھی ٹیڑھا نہیں ہوگا اور اس کے ساتھیوں کو تو میں نے ناجائز اسلحہ رکھنے اور ہوائی فائرنگ کرنے کے جرم میں حوالات میں بند کر دیا ہے اور اس کا مقدمہ تیار کر رہا ہوں۔"

خان نے ہم سے بغل گیر ہو کر خدا حافظ کہا۔ بولا۔

"تمہارے پاس گاڑی نہیں ہے کیا؟"

میں نے کہا۔

"جی نہیں! مگر ہم ٹیکسی کرالیں گے۔ سٹیشن یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا سٹیشن پہنچ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور سے پنڈی اور پنڈی سے لاہور والی ریل کار نئی نئی چلی تھی۔ لاہور سے یہ ریل منہ اندھیرے چلا کرتی تھی جبکہ راولپنڈی سے تین ساڑھے تین بجے بعد دوپہر چلتی تھی۔ اس میں سیٹ بک کرانی پڑتی تھی۔ ہم اللہ توکل آگئے تھے۔ ہمیں دو سیٹیں مل گئیں۔

لاہور ریل کار رات کے نو' ساڑھے نو بجے پہنچی۔ اشفاق نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں یہ بات کبھی کسی کو نہیں بتاؤں گا لیکن آج میں نے اس کا یہ وعدہ توڑ دیا ہے۔ وہ بھی مجھے معاف کردے اور خدا بھی مجھے معاف کرے۔

اب اس لڑکی شمیم کا مختصر سا ذکر ضرور کروں گا۔

وہ بڑی کامیاب بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے گھر گرہستی کو خوب سنبھالا۔ اس کے ہاں چار لڑکے پیدا ہوئے۔ اشفاق ان کی طرف سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ ان کا حال احوال معلوم کرتا رہتا تھا اور وقت پڑنے پر ان کی مدد بھی کرتا تھا۔ کرم داد بھی بڑا اچھا خاوند ثابت ہوا۔ آج شمیم بڑی فارغ البال زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کے چاروں لڑکے برسرروزگار ہیں۔ ان کے بھی بچے ہوگئے ہیں۔ گھر میں بہوئیں آگئی ہیں۔ انہوں نے پنڈی سٹیلائیٹ ٹاؤن میں اپنا مکان

بنالیا ہے۔ جب کبھی شمیم یا اس کا کوئی بیٹا یا کرم داد لاہور آتے ہیں تو سیدھے اشفاق کے ہاں آتے ہیں اور مجھ سے بھی ملتے ہیں۔ اشفاق سے جب بھی میں اس واقعے کا ذکر کروں تو وہ کان کو انگلی لگا کر یہی کہتا ہے۔

"اللہ کا بڑا کرم ہوا تھا۔"

پاکستان میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے قیام میں قدرت اللہ شہاب، جمیل الدین عالی اور اشفاق احمد کی کوششوں کو بڑا عمل دخل تھا۔ اس گلڈ کے اغراض و مقاصد کیا تھے اور کیا رائٹرز گلڈ یہ اغراض و مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی؟ مجھے ان سوالوں سے اس وقت کوئی سروکار نہیں ہے میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان تین بڑوں کے ارادے نیک تھے اور وہ دل و جان سے پاکستان کے ادیبوں شاعروں کی بھلائی چاہتے تھے۔

دوسرے صوبوں کی طرح لاہور میں بھی رائٹرز گلڈ کا دفتر قائم ہو گیا۔ یہ دفتر منٹگمری روڈ پر ایک خستہ کوٹھی میں تھا اور اب بھی وہیں پر ہے۔ مگر اب اس کی حالت خستہ ہو گئی ہے اور اس کے چہرے پر وہ رونق اور شادابی نہیں ہے جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ شروع شروع کے زمانے میں یہاں بڑے جلسے وغیرہ ہوتے۔ باہر سے آنے والے ادیبوں، شاعروں سے ملاقاتیں ہوتیں۔ پاکستان کے کسی بھی صوبے سے کوئی ادیب، شاعر لاہور آتا تو وہ گلڈ کے دفتر میں ضرور آتا۔ میں کس کس کا نام لوں۔ سبھی آتے تھے۔ سب سے ملاقات ہوتی تھی۔

پاکستان رائٹرز گلڈ کا پہلا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تو لاہور سے ہم سب کراچی گئے۔ ایک ٹرین میں سب کی سیٹیں ریزرو تھیں۔ یہ ادیبوں کا قافلہ تھا۔ سٹیشن پر بڑی رونق لگی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر ہر طرف ادیب اور شاعر نظر آ رہے تھے۔ میں اور ابن انشاء جس ڈبے میں بیٹھے تھے اسی ڈبے میں ہمارے ساتھ صوفی تبسم صاحب بھی تھے۔ صوفی صاحب اپنی جگہ پر خود اک انجمن تھے۔ پاکستان میں ہر جگہ ان کے مداح اور شاگرد بکھرے ہوئے تھے۔

ان کی شخصیت میں امرتسری کشمیریوں کی بھرپور جھلک نمایاں تھیں۔ لہجہ خالص امرتسری کشمیریوں کا تھا۔ میں اور اشفاق ان کی باتیں بڑے مزے لے لے کر سنا کرتے تھے۔ ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گیا ہوں کہ ابن انشاء کی طرح اشفاق احمد میں بھی ظرافت کی حس بہت گہری ہے۔ ہمارا آپس میں مزاج ملا ہوا ہے۔ بڑی بڑی سنجیدہ محفلوں میں اگر ذرا سی کوئی نازک ظرافت والی بات ہو جاتی تو ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا کرتے۔ دوسروں کو کوئی خبر نہ ہوتی کہ ہم کس بات پر محظوظ ہو رہے ہیں۔

کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ وہ محفل میں بڑی سنجیدہ اور مدلل گفتگو کرتے کرتے اچانک کسی بات پر میری طرف دیکھتا تو ہم دونوں اپنی ہنسی کو بڑی مشکل سے قابو میں کرتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم ہنسی کو قابو نہ کر سکے۔ میں اجلاس سے اٹھ کر باہر جا کر زور زور سے اکیلا ہی ہنسنے لگ جاتا اور اشفاق یہ کرتا کہ گفتگو کرتے ہوئے کوئی لطیفہ بیان کر دیتا اور پھر کھل کر ہنس لیتا۔ ٹرین ابھی لاہور سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہی کھڑی تھی۔ صوفی صاحب برتھ پر سونے کے لئے اپنا تام جھام لگا رہے تھے۔ اشفاق پہلے سے کراچی پہنچ چکا تھا۔ میرے ساتھ ابن انشاء تھا۔ محمود اختر کیانی تھا اور دو تین اور ادیب بھی تھے۔ ٹرین کا وقت ہو گیا۔ گارڈ نے سیٹی بجائی۔ انجن نے وسل دیا اور گاڑی پلیٹ فارم پر ایک ہلکے سے دھچکے کے ساتھ کھسکنے لگی۔

شام کے وقت ٹرین چلی تھی۔ راستے میں اب یاد نہیں کونسا سٹیشن آیا۔ گاڑی وہاں رکی تو ایک بڑا مدبر قسم کا بزرگ مضافاتی شاعر ہمارے ڈبے کے پاس آیا۔ صوفی تبسم کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔ اس نے کہا۔

"صوفی صاحب! آپ ان لوگوں کو جا کر سمجھائیں۔ کچھ شاعر ڈبے میں بیٹھے شراب پی رہے ہیں۔ کوئی دیکھے گا ہم ادیبوں کی بڑی بدنامی ہوگی۔ سارے پریس میں یہ بات آ جائے گی۔"

صوفی صاحب کے کان کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک کان کو ہاتھ سے

جھجکتے ہوئے اس بزرگ سے پوچھا۔

"یہ خبیث کونسے ڈبے میں ہیں؟"

بزرگ شاعر نے انجن کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہاں سے تین ڈبے چھوڑ کر چوتھے ڈبے میں بیٹھے ہیں۔"

صوفی صاحب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ جوتا پہنا اور ڈبے سے اترتے ہوئے بولے۔

"ابھی جا کر ان کی خبر لیتا ہوں۔ ان کو شرم آنی چاہیے۔"

صوفی صاحب اگلے ڈبوں کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے چلے گئے۔ وہ بزرگ شاعر جنھوں نے مخبری کی تھی وہ بھی اپنے ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ٹرین چل پڑی۔ دو تین سٹیشن گذر گئے۔ رات ہو گئی تھی۔ صوفی صاحب اپنے ڈبے میں واپس نہ آئے۔ ایک بڑے سٹیشن پر گاڑی کھڑی ہوئی تو میں نے ابن انشاء سے کہا۔

"میں جا کر صوفی صاحب کا پتہ کرتا ہوں کہ وہاں گئے بھی ہیں کہ نہیں۔"

وہ ڈبہ کافی آگے تھا۔ میں کئی ڈبے چھوڑ کر اس ڈبے کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ اس کی کھڑکیاں بند تھیں۔ دروازے کی کھڑکی کا پٹ بھی گرا ہوا تھا اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دروازے پہ زور سے ہاتھ مارا۔ اندر سے کسی نے آواز دی۔

"کون ہے بھئی؟"

میں نے اپنا نام لیا تو دروازہ کھل گیا۔

"کیا بات ہے؟" وہ میرا ایک شاعر دوست تھا۔

میں نے پوچھا لیا۔

"صوفی صاحب ادھر آئے تھے۔ کہاں ہیں وہ؟"

شاعر شریر نظروں سے مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"اندر آکر دیکھ لو۔"

میں ڈبے کے اندر چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ناؤ نوش کی محفل گرم ہے اور صوفی صاحب صدر محفل بنے بیٹھے ہیں اور کسی شاعر کے کلام پر سر ہلا ہلا کر داد دے رہے ہیں۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو اشارے سے ڈانٹ کر کہا۔

"اوئے دروازہ تو بند کرو۔"

کراچی پہنچ کر ادیب شاعر اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔ کسی کو کسی جگہ ٹھہرایا گیا تھا۔ کوئی اپنے کسی رشتے دار کے ہاں چلا گیا۔ رائٹرز گلڈ کا مرکزی اور عارضی دفتر ا یکسلیئر ہوٹل میں تھا۔ اشفاق احمد مجھے ملا تو کہنے لگا۔

"تمھارے لئے شہاب صاحب نے اسی ہوٹل میں ایک کمرے کا بندوبست کروایا ہے۔"

میں بڑا خوش ہوا۔ کیونکہ ا یکسلیئر ہوٹل اس زمانے کے کراچی کے اعلیٰ ترین اور صاف ستھرے ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا۔ اشفاق مجھے میرے کمرے میں لے آیا۔ چھوٹا سا مگر بڑا صاف ستھرا کمرہ تھا۔ کہنے لگا۔

"میں شہاب صاحب کے پاس ہی ٹھہرا ہوں مگر فکر نہ کرو۔ ہماری ملاقات ہوتی رہے گی۔ یہاں روز ہی تو آنا ہوگا۔"

گلڈ کے اجلاس خالق دینا ہال میں منعقد ہوئے تھے سارا دن وہاں رونق لگی رہتی۔ کراچی کی آبادی بڑی مختصر سی تھی سڑکوں پہ کوئی رش نہیں ہوتا تھا۔ افتتاحی اجلاس میں صدر ایوب مہمان خصوصی تھے۔ سارا ہال ادیبوں، شاعروں، دانشوروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد دوسرے چھوٹے چھوٹے اجلاس شروع ہو گئے۔ میں اور ابن انشاء اکثر ان اجلاس میں سے آنکھ بچا کر بھاگ جاتے اور صدر کے علاقے کی سیریں کرتے۔ کبھی میں اکیلا نیچے آکر ہوٹل کی بار میں بیٹھ جاتا۔

کسی روز شام کو ہم سمندر کی سیر کو نکل جاتے۔ ایک روز ہمارے ساتھ

اشفاق احمد بھی تھا۔ اسے زبردستی ساتھ کھینچنا پڑتا تھا۔ اس روز ہم تینوں کلفٹن گئے۔ کراچی کا سمندری ساحل اس زمانے میں بھی بالکل خالی خالی ہوتا تھا۔ ساحل پر کوئی درخت نہیں تھا۔ اب وہاں ناریل کے درخت لگانے کی کوشش ضرور کی گئی ہے مگر یہ تجربہ کامیاب نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کراچی کی سمندری ہوا جنوب مشرقی سمندروں کی ہوا نہیں ہے۔ مگر سمندر کا جلال وہی ہے جو سمندر کا ہوا کرتا ہے۔ انسان یہ سوچ کر حیران ہوتا ہے کہ اتنے عظیم الشان سمندر کو زمین نے کس طرح اپنی کشش کے جال میں جکڑ رکھا ہے۔ صرف چاند رات کو سمندر کی باجبوت موجیں چاند کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں اور اچھل اچھل کر چاند کی طرف جانے کی کوشش کرتی ہیں اور یوں ساحل کے قریب ایک علاقہ سارے کا سارا زیر آب آجاتا ہے۔ اب ساحل کے قریب کراچی کا سمندر بھی آلودہ ہو گیا ہے۔ کراچی کی اپنی فضا بھی آلودہ ہو گئی ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس شہر کو دشمن کی نظر لگ گئی ہے۔ میں بری نظر کا قائل ہوں۔ بری نظر لگ جاتی ہے بری نظر یورپ اور امریکہ میں لگ جاتی اگر وہاں بری نظر اور حاسدانہ نظر ڈالنے والے لوگ ہوتے۔ مگر وہاں لوگوں کو بری نظر نہیں لگتی۔ کیونکہ وہاں لوگ دوسرے کو بری نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ وہ لوگ بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر حسد کرتے ہیں۔ زیادہ تر رشک کرتے رہیں اور رشک ایک صحت مند جذبہ ہے۔ حسد میں آدمی دوسرے کے مرجانے کی بددعا کرتا ہے اور رشک میں آدمی اس سے زیادہ ترقی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مگر جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں تب کراچی کی فضا بڑی خوبصورت تھی۔ لوگوں کی نگاہیں صحت مند اور پاک تھیں۔ ساحل سمندر پر دور دور سے آنے والی موجوں کی آواز دور تک سنائی دیتی تھی۔ اب کلفٹن سے ذرا الگ ہو جائیں تو سمندر کی آواز رکشوں اور ویگنوں کے شور میں گم ہو جاتی ہے۔ جس سڑک پر ایکسلشر ہوٹل تھا وہ سڑک شام کو شفق کی روشنی میں

سنہری ہو جاتی۔ چونکہ سڑک پر ٹریفک بہت ہی کم ہوتا تھا اس لئے ڈوبتے سورج کی سرخ روشنی دور تک سڑک پر دکھائی دیتی۔ گلڈ کا عارضی دفتر ہوٹل کی دوسری منزل پر تھا۔ شام کو یہاں پر ہماری خوب محفل لگتی۔ ابن انشاء اور میں تو تقریباً روزانہ ہی وہاں شام کے وقت موجود ہوتے تھے۔ اشفاق احمد بھی وہاں شہاب صاحب کے ساتھ آجاتا۔ پھر محفل کا رنگ نکھر جاتا۔ وقت ملتا تو میں، ابن انشاء اور اشفاق صدر کے فٹ پاتھ پر لگی پرانی کتابیں دیکھنے نکل جاتے۔ وہاں اردو انگریزی کتابوں کے ڈھیر لگے ہوتے۔ اشفاق اور ابن انشاء وہاں بیٹھ جاتے اور کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھتے۔ ایک بار ابن انشاء نے کہا۔

"ایک دن ہماری کتابیں بھی اس طرح فٹ پاتھ پر پڑی ہوں گی۔"

صدر میں ہی کافی ہاؤس بھی تھا۔ وہاں بیٹھ کر کافی پیتے اور کراچی کے ادیبوں اور دانشوروں سے باتیں کرتے۔ کراچی میں ابھی آبادی کا سیلاب نہیں آیا تھا اور چیزیں بڑی خالص مل جاتی تھیں۔ چنانچہ کراچی کے کافی ہاؤس کی کافی بھی بڑی خالص اور تیز ہوتی تھی۔ یہاں بڑے بڑے یگانہ روزگار دانشوروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ جن کی یادیں مجھے آج بھی بڑی عزیز ہیں۔ ہم لوگ تقریباً ایک ہفتہ کراچی میں رہے۔ پھر لاہور واپس آگئے۔ یہاں آتے ہی رائٹرز گلڈ کے انتخابات شروع ہو گئے۔ انتخابات کے ساتھ سیاست بھی گلڈ میں داخل ہو گئی اور سیاست نے فضا کو آلودہ کرنا شروع کر دیا۔ مجھے نہ گلڈ کی سیاست سے کوئی سروکار تھا نہ انتخابات سے کوئی دلچسپی تھی۔ میں الگ ہی رہا۔ ابن انشاء کا دفتر بھی گلڈ کے دفتر کے ایک کمرے میں ہی تھا۔ میں اگر وہاں جاتا تو صرف ابن انشاء سے ملنے کے لئے جاتا۔ یا جب اشفاق وہاں تھا تو دوپہر کے بعد اس سے ملنے چلا جاتا۔ چائے کا دور چلتا۔ خوب باتیں کرتے لطیفے بازی ہوتی۔ تھوڑی دیر کے لئے میں اشفاق احمد کو ادب کی سیاست سے نکال کر زندگی کے شالامار باغ میں لے جاتا جہاں آم کے درختوں میں کوئلیں بول رہی ہوتیں اور فضاؤں میں آم کی میٹھی خوشبو ئیں پھیلی ہوتیں۔

جس دن اشفاق احمد ریڈیو سٹیشن آتا تو مجھے پتہ چل جاتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ اپنے ضروری کام سے فارغ ہونے کے بعد اوپر دوسری منزل میں میرے کمرے میں آجاتا اور کبھی میں اسے تلاش کرلیتا۔ عام طور پر ہماری محفل اکرم بٹ صاحب کے کمرے میں جمتی تھی۔ اکرم بٹ کے کمرے میں کام بھی ہوتا تھا اور آرٹسٹوں کی رونق بھی لگی رہتی تھی۔ شروع گرمیوں کے موسم میں موتیا کھلتا تو گلوکارہ آشا پوسلے اپنی کوٹھی سے توڑ کر موتیوں کے پھول لاتی اور اکرم بٹ کی میز پر بھی پھولوں کی ڈھیری رکھ جاتی۔ کسی روز ملکہ غزل فریدہ خانم بھی اپنی گاڑی میں موتیے کے پھول چنگیر میں بھر کر لے آتی۔ اس روز اکرم بٹ کا کمرہ موتیے کی خوشبو سے مہک رہا ہوتا۔ اشفاق پہلے سے وہاں بیٹھا ہوتا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتا اور چائے پیتے ہوئے ہم باتیں کرنے لگتے۔ اگر سردیوں کا موسم ہوتا تو ہم ریڈیو سٹیشن کے سامنے والے پلاٹ میں گلاب کی کیاریوں کے پاس آکر بیٹھ جاتے۔ وہیں چائے منگوا کر پیتے۔ کیاریوں میں ولایتی گلاب کے رنگ برنگ پھول سنہری دھوپ میں خوب کھلے ہوتے تھے۔ کوئی ہلکا گلابی ہوتا' کوئی گہرا سرخ' کوئی زرد اور کوئی بالکل سفید۔۔۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ نازک حسین ترین پھول زمین کے اندر سے نکلے ہیں۔ یہ تو کوئی آسمانی مخلوق لگتی تھی۔ ہمیں پلاٹ میں بیٹھے دیکھ کر کبھی اصغر حسین وائلن نواز بھی ہمارے پاس آجاتا۔ اصغر حسین کو سب اچھی کے نام سے بلاتے تھے۔ بڑا ہنس مکھ اور دل نواز آرٹسٹ تھا۔

کلارنٹ نواز صادق علی مانڈو وہاں سے گزرتا تو وہ بھی ہمیں دیکھ کر

آجاتا۔ صادق علی مانڈو ملک کے نامور کلارنٹ نواز ہیں۔ ان کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ریڈیو سٹیشن کے ہال میں جشن بہاراں کی تقریب منعقد ہونے والی تھی۔ سٹیشن ڈائریکٹر نے مانڈو صاحب کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ تمام آرٹسٹوں کا انتظام کریں گے تاکہ وہ وقت پر ریڈیو سٹیشن پہنچ جائیں۔ ہم لوگ ریڈیو کی کنٹین کے باہر لمبی میز کے آگے بنچ پر بیٹھے تھے کہ صادق علی مانڈو بھی ہمارے پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ سٹیشن ڈائریکٹر قریب سے گزرے تو انہوں نے مانڈو صاحب کو دیکھ کر پوچھا۔

"مانڈو صاحب! سب آرٹسٹ آگئے ہیں نا؟"

مانڈو صاحب نے فوراً جواب دیا۔

"سب آرٹسٹ پہنچ گئے ہیں جناب! ـــــ ملکہ ترنم نورجہاں بھی آگئی ہیں۔ ملکہ موسیقی روشن آراء بیگم بھی آگئی ہیں۔ ملکہ غزل فریدہ خانم بھی آگئی ہیں۔ بس اب صرف ملکہ الزبتھ کا انتظار ہے۔"

کسی روز ہم ایوب رومانی کے کمرے میں بیٹھ کر چائے پیتے اور محفل لگاتے۔ ایوب رومانی بڑی زندہ اور توانا شخصیت کا مالک تھا۔ موسیقی پر اسے کافی عبور حاصل تھا۔ موسیقی کی تعلیم اس نے بھائی لال امرتسری سے حاصل کی تھی۔ وہ تمام رموز سے واقف تھا۔ ہنس مکھ' خوش شکل اور جوان رعنا تھا۔ میرے اور اشفاق کے ساتھ اس کی بے تکلفی تھی۔ چنانچہ اس کے کمرے میں بیٹھ کر محفل لگانے کا بڑا مزا آتا تھا۔ ایوب رومانی ریڈیو سٹیشن کے ان تناور درختوں میں سے ایک بھرپور درخت کی طرح تھا جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر آرٹسٹ پروڈیوسر ریڈیو کے لئے نئے نئے پروگرام سوچتے اور تخلیق کرتے تھے۔ یہ درخت ایک ایک کرکے گرتے چلے گئے۔

وقت کے ساتھ ساتھ اشفاق کا جسم بھاری ہوگیا تھا اور اس کے چہرے پر متانت اور بزرگی طاری ہوگئی تھی۔ جوانی کے دنوں میں بھی وہ اپنے چند

ایک بے تکلف دوستوں کے سوا کسی سے نہیں کھلتا تھا۔ مگر اب وہ بڑا مدبر ہوگیا تھا۔ صرف میں اسے اس خول سے باہر نکالتا تھا۔ افسانے لکھنے اس نے چھوڑ دیئے تھے۔ اب اس کی ساری توجہ ٹیلی ویژن کی طرف ہوگئی تھی۔ ٹیلی ویژن کے لئے وہ بڑے زوردار ڈرامے لکھتا۔ ڈراموں کی سیریل لکھتا۔ وہ ان ڈراموں کو بڑی کاوش اور محنت سے لکھتا تھا۔ ایک بار اس نے "گریں کارڈ" کے نام سے بڑا زبردست اور پر اثر ڈرامہ لکھا۔ میں نے ڈرامہ ٹی وی پر دیکھا تو اس کی کردار نگاری دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مجھے ملا تو میں نے اسے کہا۔

"تم نے اتنا بڑا موضوع ٹیلی ویژن پر ضائع کر دیا ہے۔ بہتر تھا کہ اس پر تم ایک ناولٹ لکھتے۔"

مگر وہ نہ مانا۔ کہنے لگا۔

"ریڈیو' ٹی وی کا میڈیم بڑا وسیع ہے۔ میں اگر ناولٹ لکھتا تو کتنے لوگ اسے پڑھتے؟ تم بتاؤ۔ زیادہ سے زیادہ چند ہزار آدمی اسے پڑھتے۔ مگر ٹیلی ویژن پر بڑے چھوٹے کو لاکھوں' کروڑوں آدمیوں نے دیکھا ہے۔ یوں میرا خیال کروڑوں آدمیوں تک پہنچ گیا ہے۔"

مجھے اس وقت بھی اس معاملے میں اشفاق سے اختلاف تھا اور آج بھی ہے۔ خیر اب تو اشفاق احمد نے ٹیلی ویژن کے لئے لکھنا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں اب بھی یہی کہوں گا کہ اس نے ٹیلی ویژن کے لئے لکھ کر اپنی صلاحیتوں کو ضائع کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹی وی پر لاکھوں' کروڑوں لوگ دیکھ لیتے ہیں۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ ان کے افسانے بنا دیتا یا ناول لکھ دیتا تو آج وہ لوگوں کے پاس موجود ہوتے اور لوگ انہیں پڑھ رہے ہوتے۔ مگر اشفاق کو تو ٹیلی ویژن کے لئے لکھنے کا جنون ہوگیا ہوا تھا۔ میرے خیال کے مطابق اور میری ذاتی رائے میں ٹیلی ویژن اور جم لکھنے والے رائٹروں کے لئے مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ دیکھ لیں۔ آج بھی لوگ اشفاق احمد کے افسانے "گڈریا" اور ناولٹ "مہمان

بہار" کی بات کرتے ہیں۔ لوگوں کو اس کے افسانے یاد ہیں۔ اس کے ٹیلی ویژن کے ڈرامے لوگ بھول گئے ہیں۔ مگر میں اشفاق کو نہیں سمجھا سکتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں کبھی آ ہی نہیں سکتی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اردو ڈائجسٹوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ ان ڈائجسٹوں میں سنسنی خیز جاسوسی کہانیاں' شیر کے شکاریوں کے قصے اور لڑائی' مار' دھاڑ والے واقعات چھپتے تھے۔ ان رسالوں کا ایک اپنا الگ کمرشل مزاج تھا۔ اشفاق اس مزاج کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے ایک ڈائجسٹ میں "سفر در سفر" کے نام سے اپنا سفرنامہ لکھنا شروع کیا جو خالص ادبی چیز تھی۔ یہ سفرنامہ مجھے خود اس ڈائجسٹ میں اجنبی اجنبی سا لگا۔ اشفاق کا خیال تھا کہ وہ کمرشل رسالوں میں ادب کی شمع جلائے گا۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ یہ ایک ان نیچرل بات تھی اور وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ ہاتھی کی گردن میں رسی ڈال کر اسے اپنے گھر میں لانے کی کوشش تھی جس میں اشفاق ناکام رہا۔

کراچی کے ایک ڈائجسٹ کے ایڈیٹر نے مجھ سے کہا۔

"آپ اشفاق صاحب سے کہیں کہ وہ ہمارے ڈائجسٹ کے لئے کوئی سلسلہ شروع کریں ہم انہیں معقول معاوضہ دیں گے۔ میں خود ان سے ملا ہوں اور ان کو دعوت دی ہے مگر وہ ٹال گئے ہیں۔"

میں نے جواب میں کہا۔

"ڈائجسٹ کے لئے لکھنے کے واسطے ایک خاص قسم کا کمرشل مزاج ہونا چاہیے جو اشفاق کے پاس نہیں ہے۔ ویسے میں اس کو کہہ کر کوئی سیریز آپ کے لئے لکھوانے کی کوشش ضرور کروں گا۔"

میں نے اشفاق سے بات کی تو وہ بولا۔

"یار! میں ڈائجسٹ کے لئے کیا لکھوں؟"

میں نے کہا۔

"تم ایسا کرو ڈائجسٹ میں سلسلے وار اپنی آپ بیتی لکھنا شروع کر دو۔

تم مشہور آدمی ہو۔ لوگ تمہارے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ لوگ اسے پسند کریں گے۔"

اشفاق نے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں مجھے کتنے صفحے لکھنے ہوں گے؟"

میں نے کہا۔

"یہ تمہاری آپ بیتی ہوگی۔ تمہیں ڈائجسٹ کے کم از کم پندرہ بیس صفحے تو ہر بار ضرور لکھنے ہوں گے۔"

"ڈائجسٹ کی لکھائی تو بڑی باریک ہوتی ہے اور سطریں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ تمہارے خیال میں مجھے مسودے کے کتنے صفحے ہر بار لکھنے پڑیں گے؟"

مجھے ڈائجسٹوں کی چھپائی وغیرہ کا اندازہ تھا۔ میں نے اشفاق کے مسودے بھی دیکھے ہوئے تھے کہ وہ کتنی سلپیں یا صفحے لکھتا ہے اور ہر صفحے پر کتنی سطریں ہوتی ہیں۔ میں نے تھوڑا حساب لگا کر بتایا۔

"تمہیں ہر ماہ کم از کم ساٹھ ستر صفحے لکھنے پڑیں گے۔"

"اف توبہ۔" اشفاق گھبرا گیا۔ "یہ تو پورا مسودہ ہو جائے گا۔ نہیں یار میں اتنے صفحے کیسے لکھوں گا اور پھر وہ بھی ہر مہینے! اور صرف ڈائجسٹ کے لئے؟"

اشفاق احمد کا ہینڈ رائٹنگ بڑا خوبصورت ہے۔ اس کے لفظ بڑے جم کر کاغذ پر درج ہوتے ہیں۔ جبکہ میرا ہینڈ رائٹنگ کاغذ کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ کاغذ لکیردار ہو تو میری سطریں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ قلم یا بال پوائنٹ نیلے رنگ کا ہو تو میری لکھائی بدل جاتی ہے۔ میں صرف سفید کاغذ کالے بال پوائنٹ سے ہی ٹھیک لکھ سکتا ہوں۔ مگر اشفاق کی لکھائی ہر بال پوائنٹ اور ہر قلم اور ہر سیاہی کے ساتھ ٹھیک رہتی ہے۔ "تلقین شاہ" کا مسودہ وہ کاغذ کاٹ کر اس کی لمبی لمبی سلپیں بنا کر ان پر لکھتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب بھی وہ ایسا

ہی کرتا ہوگا۔ لکھنے میں اس کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ اہل زبان والوں کی اردو لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی یہ کوشش غیر شعوری ہوتی ہے۔ مثلاً ترکھانوں کے کسی اوزار کے لئے اگر پنجابی کا کوئی لفظ موجود بھی ہو تو وہ اردو کا لفظ ڈھونڈ کر لائے گا چاہے وہ چالو اردو زبان میں استعمال ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔ ابن انشاء بھی اپنی نثر میں یہی کیا کرتا ہے۔ مگر ان دونوں کی اردو سادہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ جبکہ میں پنجابی میں اردو لکھتا ہوں اور میرے کردار اکثر پنجابی کے الفاظ بول جاتے ہیں۔

لباس کے معاملے میں اشفاق کا معاملہ یہ ہے کہ شروع شروع میں وہ پتلون قمیض استعمال کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے شلوار قمیض کو اپنا لیا اور آج تک وہی پہن رہا ہے۔ وہ خوش لباس ہرگز نہیں ہے۔ اسے اچھا لباس پہننے کا شوق بھی نہیں ہے۔ وہ اس لئے سادہ لباس نہیں پہنتا کہ ایسا کرنا سادگی اور درویشی کی علامت ہے۔ بلکہ اس کی وجہ ضرورت سے زیادہ اور کنجوسی کی حد تک پہنچی ہوئی کفایت شعاری ہے۔ وہ بڑا زبردست کفایت شعار ہے۔ پچھلی سے پچھلی سردیوں میں ایک رات میں اس کے گھر گیا تو وہ پرانا سا کالا گرم ہاف کوٹ اور پرانی سی شلوار قمیض پہن کر کمرے میں آیا تو مجھے بالزاک کا بڈھا گوریو یاد آ گیا۔

کھانے پینے کے معاملے میں بھی وہ بڑا کفایت شعار ہے۔ نہ سگریٹ پیتا ہے، نہ شراب پیتا ہے، نہ زیادہ چائے پیتا ہے، نہ ہوٹلوں میں بیٹھ کر قیمتی کھانے کھاتا ہے۔ کبھی پان کھا لیتا تھا مگر اب وہ خدا جانے کیا کوٹ کر اس کی چٹکی منہ میں ڈال لیتا ہے اور چباتا رہتا ہے اور اس کے قریب بیٹھے ہوں تو کبھی سونف کی خوشبو آتی ہے۔

اس کے قریب بیٹھے ہوئے مجھے کبھی کسی پرفیوم کی خوشبو نہیں آئی۔ عید کارڈ وہ اکثر اپنے ہاتھ سے بنا کر مجھے پوسٹ کرتا ہے۔ اس معاملے میں وہ بڑا اچھا گھریلو دستکار ہے۔ اسے فوٹوگرافی اور پرنٹنگ کا بھی بڑا شوق ہے۔ کبھی

اس نے ان شعبوں کے متعلق ہر قسم کا سامان گھر میں لا کر رکھ لیا تھا۔ مگر مجھے کبھی کبھی نہیں دکھایا۔ نہ کبھی اس نے میری کوئی تصویر اتاری ہے۔ کبھی کبھی میرا بڑا جی چاہتا ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم میں اسے سگریٹ ہی لگا دوں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اشفاق کی قوت ارادی بڑی مضبوط ہے اور اگر میں نے چالاکی سے کام لے کر اسے سگریٹ لگوا بھی دیئے تو وہ خود ہی پیا کرے گا مجھے ایک سگریٹ بھی کبھی نہیں پلائے گا۔ شروع شروع میں وہ ایک آدھ سگریٹ پی لیا کرتا تھا۔ کش لگا کر اس کا دھواں منہ ہی سے باہر پھینک دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کسی نے اسے سمجھایا ہو گا کہ اس طرح تو تُو اپنی دولت ضائع کر رہا ہے یا تو سگریٹ کے دھوئیں کو پیٹ کے اندر لے جا تاکہ کچھ تو پتہ چلے کچھ تو تمہارے پیٹ کے اندر جائے اور اگر صرف کش لگا کر دھواں منہ ہی سے باہر پھینک دینا ہے تو کیا فائدہ؟ اشفاق نے ایک دن وہ کبھی کبھی کا سگریٹ پی لینا بھی ترک کر دیا۔

میرے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ میں یا تو قدم اٹھانے کے بعد سوچتا ہوں یا سوچتا رہتا ہوں اور قدم نہیں اٹھاتا۔ مگر اشفاق ایسا ہرگز نہیں کرتا۔ وہ بڑا سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے۔ بلکہ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہے اور اس کی یہ عادت مجھے بڑی پسند ہے۔ آدمی کو سوچ سمجھ کر کوئی کام کرنا چاہیے۔ اس طرح آدمی بہت سی مصیبتوں سے بچ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس نے ایک بڑے ہوٹل میں ایک ہی دن میں دونوں بیٹوں کی شادی کا فرض ادا کر دیا۔ یہ پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کا نتیجہ ہے۔

اس نے ماڈل ٹاؤن میں جو مکان بنایا ہے اس کا ڈرائینگ روم بڑا صاف ستھرا ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی جو باتھ روم ہے وہ گندا ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اشفاق احمد کے پاس بڑی دولت ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے اس کی دولت کی کبھی ایک جھلک تک نہیں دیکھی۔ میں اس کا شاید واحد بے تکلف دوست ہوں۔ لوگ اس پر دولت مند

ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ یا پھر اس کی ناموری سے حسد کرتے ہیں۔

وہ کانٹا بدل کر ایک اور لائن پر آگیا ہوا ہے۔ یہ تصوف کی لائن ہے۔ مجھے تو اس میں کبھی کوئی تصوف نظر نہیں آیا۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ وہ صوفی ہے۔ میں نے آج تک سارے کشمیری صوفی ہی دیکھے ہیں جن کے دستر خوانوں پر انواع و اقسام کی باقر خانیاں' اراروٹ' شیرمال اور کلچے اور رش ہالو اور گولڈن ہریسے کی چکتی ڈشیں اور روغنی نان چنے ہوئے ہوتے تھے۔ مثلاً صوفی تبسم' امرتسر کے صوفی غلام محمد اور صوفی محمود کاکا ـــــ کیا خوش خوراک خوش لباس صوفی تھے۔ بجلی کی روشنی یا دھوپ میں آتے تو سرخ و سپید چہروں کا روغن چمکنے لگتا تھا۔ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اپنے دستر خوان پر لاتے تھے اور زبردستی کھلاتے تھے اور زردے کا قاب بھر کر بچوں کے لئے ساتھ بھی کر دیتے تھے۔ ہر وقت دعوت کرنے' دیگیں کھڑکانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرتے رہتے تھے۔ ذرا کسی نے کہا۔

"صوفی جی آج موسم بڑا اچھا ہے۔"

صوفی صاحب نے فوراً اعلان کر دیا۔ اٹھاؤ دیگیں چلو بڑی نہر پہ۔ وہیں روغن جوش پکے گا' زردہ بھی پکے گا' باغ کی سیر ہو گی۔ میں تو ایسے ہی صوفی حضرات کو جانتا ہوں۔ اگر مجھے کوئی یہ کہے کہ اشفاق احمد صوفی ہو گیا ہے تو بھلا میں کیسے یقین کر سکتا ہوں۔ جیسا وہ اب تک ہے اسے دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ صوفی نہیں ہے۔ ہاں! اللہ میاں نگاہوں اور دلوں کے پھیر دینے والا ہے۔ وہ اگر چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔

ابن انشاء کی طرح اشفاق احمد کے پاس بھی جو خواتین اس کے افسانوں سے متاثر ہو کر آتیں ان کے ساتھ بڑے ادب و آداب سے گفتگو کرتا اور شرم کے مارے بار بار چہرہ سرخ ہو جاتا۔ وہ جب کسی لڑکی کو بزرگ بن کر "گڑے" کہتا تو بعد میں میں اس کی سخت سرزنش کرتا کہ یہ تم لڑکیوں کے آگے بزرگ کیوں بن جاتے ہو؟ کیوں اپنا مستقبل تاریک کر رہے ہو؟ مگر جیسا کہ

میں پہلے آپ کو بتا چکا ہوں اشفاق احمد طبعاً" شریف آدمی ہے۔ کئی رومان اس کے پاس آئے اور اسے ہاتھ لگا کر آگے نکل گئے۔ اشفاق احمد کی شخصیت اور اس کی باتوں میں ایسا اثر ہے کہ لوگ بہت جلد اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔

ہر دور میں اس کی شخصیت کے مدار کے گرد دو چار سیارے ضرور گردش کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض سیاروں نے اس سے منحرف ہو کر اپنا راستہ تبدیل کر لیا ہے اور بعض آج بھی جھول کھا کھا کر کسی نہ کسی طرح گردش کئے جا رہے ہیں۔ ایسا ضرور ہوا ہے کہ جو بھی اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر اس کے قریب آیا کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اندر سے اس کا مخالف بن گیا۔ شروع شروع میں اشفاق احمد کے حلقۂ اثر میں جو لوگ بیٹھا کرتے تھے وہ اس کے افسانوں اور اس کے فن کی ضرور باتیں کرتے تھے۔ مگر بعد میں جو لوگ اس کے قریب آئے ان کے منہ سے میں نے اشفاق کے افسانوں اور اس کے افسانوی کرداروں کی کبھی کوئی بات نہیں سنی۔ کچھ لوگ اس لئے بھی اشفاق احمد کے قریب آ جاتے تھے کہ اشفاق کی بڑے بڑے سرکاری اور غیر سرکاری افسروں سے ملاقات تھی اور وہ اشفاق کی مدد سے اپنا کوئی نہ کوئی کام نکلوانا چاہتے تھے۔ دوسروں کے کام آنے کے معاملے میں اشفاق احمد بے حد احتیاط سے کام لیتا ہے۔ بڑی زیرکی اور معاملہ فہمی کے ساتھ مسئلے کے سارے پہلوؤں پر غور کرتا ہے۔ وہ کام کر دیتا ہے مگر غور کرنے پر بہت وقت لگاتا ہے۔

اس کا افسانہ "گڈریا" اس کے دل کی ترجمانی کرتا ہے۔ میں جب اس افسانے پر ہاتھ رکھتا ہوں تو مجھے صفحے کے اندر اس کے دل کی ہلکی ہلکی دھڑکن محسوس ہوتی ہے۔ اشفاق احمد کے اندر ایک درخت بھی اگا ہوا ہے۔ یہ درخت وہ اپنے آبائی گاؤں گرھ مکتسر سے اپنے ساتھ لایا ہے۔ اس درخت پر چڑیاں بیٹھتی ہیں۔ طوطے بولتے ہیں۔ خزاں میں اسی درخت کے پتے زرد ہو

کر جھڑ جاتے ہیں اور بہار میں اس کی شاخوں پر گلابی اور نسواری نازک کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اس درخت پر ایک بلبل آ کر بیٹھا کرتی تھی۔ اشفاق نے مجھ سے اس کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ کسی وقت میں بلبل کی اداس آواز سنتا تو اشفاق سے اس کے بارے میں سوال کرتا۔ وہ ہنس کر ٹال دیتا۔ میں اصرار کرتا تو وہ کہتا۔

"میرے درخت کی شاخ پر کوئی بلبل کہاں سے آ کر بیٹھے گی۔ تم نے لارنس باغ سے آئی کسی بلبل کی آواز سنی ہوگی۔"

یہ اس زمانے کی بات ہے جب اشفاق احمد کا رسالہ "داستان گو" نیا نیا شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اسے اٹلی سے رسالے آتے تھے۔ جن میں سے وہ کوئی مضمون ترجمہ کر کے چھاپ دیتا یا کوئی کارٹون یا لطیفہ نقل کر لیتا۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ وہ خالی وقت میں "داستان گو" کے دفتر کی میز پر بیٹھا کاغذ پر انگریزی میں ایم آر کے لفظ شکستہ انداز میں لکھتا تھا۔ جیسے کسی کے دستخط کی نقل اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس کے دستخط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اشفاق ہنس دیا۔

"قلم چالو کرنے کے لئے ویسے ہی ایم آر لکھ دیتا ہوں۔ یہ کسی کے دستخط نہیں ہیں۔"

مگر وہ ایک اطالوی لڑکی ماریا کے نام کے مختصر دستخط تھے۔ اس اطالوی لڑکی کے متعلق اشفاق احمد نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔

ایک دن کی بات ہے۔ میں "داستان گو" کے دفتر میں اس کے پاس بیٹھا چائے پی رہا تھا اور نیچے مال روڈ کی مختصر ٹریفک کو دیکھ رہا تھا۔ ریگل والے بس سٹاپ پر بس آ کر رکتی تو اس میں سے دو چار آدمی اتر جاتے۔ ایک دو سواریاں چڑھ جاتیں۔ بس آگے روانہ ہو جاتی۔ اومنی بس کی گاڑیاں ابھی بہت صاف ستھری تھیں اور ان کا رنگ روغن بھی ابھی قائم تھا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ بڑی چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں اشفاق کی میز کے پہلو میں کرسی پر بیٹھا

تھا۔ اشفاق اپنے رسالے کے لئے کوئی مسودہ دیکھ رہا تھا اور اس کی نوک پلک درست کر رہا تھا۔ اتنے میں ڈاکیا آ کر ڈاک دے گیا۔ اشفاق مسودہ پرے کر کے ڈاک کھولنے اور پڑھنے لگا۔ میں کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ وہ ایک سفید لفافہ چھری سے کھول رہا تھا جس پر یورپ کے کسی ملک کے ٹکٹ لگے ہوئے تھے۔ لفافے کے اندر سے نیلے رنگ کا ایک کاغذ نکلا۔ اشفاق نے نیلے کاغذ پر لکھی ہوئی مختصر تحریر پڑھی اور میں نے محسوس کیا کہ کچھ دیر کے لئے وہ بالکل ساکت سا ہو گیا ہے۔

میں نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات ہے؟"

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"تم مجھ سے بہت پوچھا کرتے تھے کہ میں ایم آر کے الفاظ جو کاغذ پر لکھا کرتا ہوں یہ کس کے دستخطوں کی مشق کر رہا ہوں۔ لو ——— یہ پڑھ لو۔"

تحریر شکستہ انگریزی میں تھی۔ تین چار فقرے تھے۔ یہ کسی اطالوی لڑکی کا خط تھا۔ اوپر ڈیئر اشفاق لکھا تھا۔ نیچے لکھا تھا۔

"میں دوبارا ہسپتال میں داخل ہو گئی ہوں لگتا ہے یہ بیماری مجھے تم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر رہی ہے۔ ایک بار آ کر مجھ سے مل لو۔ پھر مجھے اپنی موت کا کوئی افسوس نہیں ہو گا۔"

نیچے کونے میں ماریا لکھا تھا۔

فضا کا موڈ ہی ایکدم بدل گیا۔ میں نے خط پڑھ کر اشفاق کی طرف دیکھا۔

"تو یہ وہ لڑکی ہے جس کا نام تم کبھی کبھی کاغذ پر لکھا کرتے تھے۔"

اشفاق نے خط لفافے میں ڈال کر میز کی دراز میں رکھ دیا۔ اس کے چوڑے چکلے صحت مند چہرے پر بڑی اداس مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا۔

"بڑی اچھی لڑکی ہے یہ۔ یورپ کی لڑکی لگتی ہی نہیں۔"

"کیا تم اس سے محبت کرتے ہو؟ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔"

"محبت!" اشفاق نے مسکراتے ہوئے گہرا سانس لیا اور بولا۔

"تم تو جانتے ہو میں کبھی ان باتوں میں نہیں پڑا۔ محبت کے معاملے میں میں بہت زیادہ شرمیلا ہوں۔"

"پھر اس لڑکی کا کیا قصہ ہے۔ اس کے خط سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے اور ظاہر ہے تم بھی اس سے محبت کرتے ہو گے۔"

اشفاق کے سامنے چائے کی پیالی پڑی تھی جس میں اس کی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے چائے کا ٹھنڈا گھونٹ لیا اور خالی پیالی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔

"اگر تم مجھ سے میرے دل کا حال پوچھتے ہو تو تم سے میں کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ماریا سے ایک طرح کا لگاؤ ضرور تھا تم اسے محبت ہی کہو گے۔ ماریا بھی اسے محبت ہی سمجھتی تھی۔ مگر جس طرح سے لوگ روایتی انداز میں محبت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملنے کو بے تاب رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی جدائی میں آنسو بہاتے ہیں۔ میرے ساتھ ماریا کے معاملے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اس کے مشرقی نسوانی حسن، اس کی حیا داری اور پاکیزہ خیالی سے متاثر ضرور تھا مگر میں نے کبھی اظہار محبت نہیں کیا تھا۔ ہاں! کبھی کبھی ایک عجیب و غریب کیفیت کی اداس لہر میرے دل کو چھو کر ضرور گزر جاتی تھی، مگر میرا خیال ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ یہ محبت وغیرہ نہیں ہو سکتی۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا ماریا نے بھی تم سے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا؟"

اشفاق احمد کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ اس کے دل میں کئی قسم کے خیالات آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ عجیب و غریب کیفیات کی اداس لہریں اس لمحے بھی اس کے دل کو چھو کر گزر رہی تھیں۔ جس طرح سمندر کی لہریں دور دور سے آ کر ساحل کو چھوتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں۔ کہنے لگا۔

"میں نے تمہیں کہا نا! مارسیا پر مشرقی اخلاقی روایات کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ہم نے ایک مدت روم اور فلارنس میں ایک ساتھ سیر و سیاحت کرتے' ریستورانوں میں چائے پیتے' آرٹ گیلریوں میں اٹلی کے نامور مصوروں کی تصویریں دیکھتے گزاری۔ موسم خوشگوار ہوتا تو کسی پارک میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے درختوں کے نیچے سیر کرتے یا پھر کسی بنچ پر بیٹھ جاتے۔ میں مارسیا کو پاکستان کے بارے میں بتاتا۔ مارسیا بڑے غور سے میری باتیں سنتی۔ اپنے بارے میں اس نے مجھے بس اتنا ہی بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ اس کا ایک بھائی تھا جس کو تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ وہ فرانس کے کسی گاؤں میں مقیم تھا اور کبھی کبھار کرسمس کے موقع پر مارسیا کو ایک کرسمس کارڈ بھیج دیتا تھا۔"

"مارسیا تمہاری یونیورسٹی میں پڑھاتی تھی کیا؟"

"نہیں۔" اشفاق نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔

"وہ روما کی ایک کتابوں کی دکان پر جاب کرتی تھی۔ جب میں روما سے واپس وطن روانہ ہوا تو وہ اسی دکان پر ملازم تھی۔ وہ مجھے ایئرپورٹ پر چھوڑنے آئی تھی۔ مجھے الوداع کہتے ہوئے بالکل مشرقی لڑکیوں کی طرح اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔"

"تمہاری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"

میرے اس سوال پر اشفاق نے چائے کی خالی پیالی کو پرے کھسکاتے ہوئے کہا۔

"یار! یہ بڑی لمبی رام کہانی ہے۔ پھر کبھی سناؤں گا۔"

میں یہ رام کہانی ضرور سننا چاہتا تھا۔ ان دنوں ہماری تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک روز میں نے اشفاق کو قابو کر لیا۔ مجھے یاد ہے جنوری دسمبر کے دن تھے۔ بڑی سردی پڑ رہی تھی۔ اس زمانے میں لاہور میں بڑی سخت سردی پڑا کرتی تھی۔ جنوری میں تو بارشیں ضرور ہوتی تھیں۔ جس کی وجہ سے سردی بڑھ جاتی۔ اس روز بھی کافی سردی تھی۔ ایک روز پہلے بارش ہوئی تھی۔ لارڈز ریستوران کے اوپر جو شاہ نشین ٹاپ کی گیلری ہوا کرتی تھی ہم وہاں آ کر بیٹھ گئے۔ میرا خیال ہے کہ اشفاق احمد کی زندگی کا یہ سب سے خوبصورت اور معصوم رومانس ہے جس نے اس کی تحریر اور اسلوب پر گہرا اثر ڈالا۔ اگرچہ اس نے اپنے رومانس کو در حدیث دیگراں ہی بیان کیا ہے۔ میں نے چائے منگوائی۔ چائے آنے تک ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ چائے آئی تو اشفاق نے اپنے قیام روما کی یادوں کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ کہنے لگا۔

"روما میں میرا زیادہ وقت یونیورسٹی میں گزر جاتا تھا۔ میں اطالوی سٹوڈنٹس کو اردو پڑھاتا تھا۔ چونکہ میں نے اطالوی زبان سیکھ لی تھی اس لئے سٹوڈنٹس کو اردو سکھانے میں بڑی آسانی ہو گئی تھی۔ یونیورسٹی میں مجھے سہ پہر کا وقت ہو جاتا تھا۔ دوپہر کا کھانا میں یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں ہی کھاتا۔ جس بلڈنگ میں میرا فلیٹ تھا وہ یونیورسٹی کمپلیکس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میرے پاس ایک ہی کمرہ تھا جس کے کونے میں بیڈ لگا تھا۔ ساتھ ہی باتھ روم تھا۔ کھڑکی عمارت کی پچھلی طرف ایک چھوٹی سڑک پر کھلتی تھی۔ یہ سڑک چھوٹے چھوٹے گول پتھر جوڑ کر بنائی گئی تھی ذرا آگے جا کر یہ نشیب میں اتر جاتی تھی۔ اس کی دونوں جانب پرانے زمانے کے رہائشی فلیٹ تھے۔ یہاں اطالوی عورتوں نے گیلریوں میں پھول دار گملے سجائے ہوئے تھے۔ یہ ایک گلی

ہی تھی۔ اطالوی عورتیں بہت زیادہ باتیں کرتی ہیں۔ وہ گیلریوں میں آ کر بیٹھ جائیں اور آپس میں اونچی آواز میں باتیں کرنے لگتیں۔ میں کھڑکی بند بھی کرتا تب بھی مجھے ان کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ گلی میں مکانوں کے درمیان تاروں پر گیلے کپڑے سکھانے کے لئے ڈال دیئے جاتے تھے۔ ہوا چلتی تو یہ کپڑے خوب جھولے جھولتے۔

اس گلی کے آگے ایک کھلا چوراہا تھا جہاں تین اطراف میں قدیم رومن بادشاہوں کے زمانے کی تاریخی عمارتیں تھیں۔ ایک کشادہ سڑک ان کے درمیان سے گزر کر شہر کے مشہور دریا تابیر کی طرف نکل جاتی تھی۔ اس دریا نے تاریخ کے کئی دور دیکھے ہیں۔ دریا کے کنارے اونچے اونچے درخت ہیں جن کی سایہ دار روشوں پر شام کے وقت لوگ چہل قدمی کرنے آجاتے ہیں۔ دریا کو ایک پرانے پل پر سے پار کریں تو آگے بائیں ہاتھ کو ایک خوشنما پارک آجاتا ہے اور دائیں ہاتھ کو ایک سڑک نشیب میں سے ہوتی ہوئی شہر کے پرانے اور گنجان علاقے کی طرف جاتی ہے۔ اسی سڑک کے ایک چوک میں کتابوں کی وہ دکان تھی جہاں ماریا ملازم تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ ماریا کو اسی دکان میں دیکھا۔ ماریا عام اطالوی لڑکیوں کی طرح شوخ اور نمائش پسند نہیں تھی۔ جسم دبلا پتلا تھا۔ بالوں کی مانگ ہماری مشرقی عورتوں کی طرح درمیان میں سے نکالتی اور بالوں کا پیچھے جوڑا بنالیتی تھی۔ آنکھوں میں ایک اداسی تھی۔ یا مجھے اس کی آنکھیں اداس لگتی تھیں۔ میں اس جذبے کا پورا تجزیہ نہیں کرسکتا۔ میں ایک ماڈرن اطالوی رسالے کی تلاش میں اس کی دکان میں گیا تو پہلے ہی کاؤنٹر پر ماریا نے مسکراتے ہوئے ایک خوش اخلاق دکاندار کی طرح میرا استقبال کیا اور اطالوی زبان میں مجھ سے کہا۔

"میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں؟"

میری گوری رنگت اور وضع قطع سے اس نے مجھے اطالوی سمجھا تھا۔ جب میں نے اطالوی زبان میں ہی اس سے بات کی تو اس نے لبوں پر ہلکی سی

مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور کہا۔

"سینور! تم اطالوی نہیں لگتے۔ کیا تم ہسپانوی ہو؟"۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں پاکستانی ہوں۔ پاکستان سے آیا ہوں اور یہاں یونیورسٹی میں اردو پڑھاتا ہوں۔ اردو ہماری قومی زبان کا نام ہے۔"

ماریا نے گردن کو ذرا سا جھکا کر جیسے میری تعظیم کی اور مجھ سے پوچھا کہ مجھے کیا چاہیے۔ میں نے اطالوی رسالے کا نام لے کر کہا کہ یہ رسالہ مارکیٹ میں کہیں نہیں مل رہا۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ ماریا کی نگاہیں کاؤنٹر پر اور کاؤنٹر کے پیچھے لگے ہوئے رسالوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔ مسکرائی اور معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"سینور! یہ رسالہ ہمارے ہاں بھی آتے ہی ختم ہوگیا ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ کو رسالہ مل جائے۔ کیا آپ کل اسی وقت آسکتے ہیں؟ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو یونیورسٹی پہنچا دوں۔ ہمارا آدمی دن میں ایک بار یونیورسٹی کا چکر لگاتا ہے۔"

تم تو جانتے ہی ہو میں آرام طلب قسم کا آدمی ہوں۔ میں نے اسے اپنا کارڈ دیا اور کہا کہ مجھے یہاں رسالہ پہنچا دیا جائے۔ ماریا نے کارڈ لے کر رکھ لیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دکان سے باہر نکل آیا۔ ماریا ایک دوسرے گاہک سے باتیں کرنے لگی۔ دریا کے پل تک آتے آتے ماریا کا خیال میرے دماغ سے نکل گیا تھا۔

○

دوسرے دن میں یونیورسٹی گیا تو میری میز پر وہ اطالوی رسالہ پڑا تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ میرے ساتھی پروفیسر نے بتایا کہ پراما بکس کی دکان سے ایک لڑکا آ کر دے گیا ہے۔ پرامایا پرانما بکس اس دکان کا نام تھا جہاں مارسیا ملازم تھی۔ میں نے بڑے شوق سے رسالہ کھولا۔ رسالے کے پہلے صفحے پر زرد کاغذ کی چھوٹی سی چٹ لگی تھی جس پر اطالوی زبان میں لکھا تھا۔

"سینور! رسالے کی قیمت میں نے ادا کر دی ہے۔"

نیچے مارسیا جوانا لکھا تھا۔ یہ مارسیا کا پورا نام تھا۔

میں نے اسی وقت ڈائریکٹری میں سے پرانما بکس کا نمبر نکال کر مارسیا کو فون کیا۔ میں اس کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتا تھا اور اس رسالے کی قیمت بھی ادا کرنا چاہتا تھا۔ فون مارسیا نے ہی اٹھایا۔ میں نے مارسیا کو اپنا نام بتایا اور رسالے کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا۔

"میں رسالے کی قیمت ادا کرنے دوپہر کے بعد آؤں گا۔"

مارسیا کہنے لگی۔

"سینور! دکان پر ضرور آئیں۔ مگر قیمت ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو میں ادا کر چکی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"مگر میں تم پر یہ بوجھ کیوں ڈالوں؟"

مارسیا کی آواز آئی۔

"سینور! تم ہمارے پاکستانی مہمان ہو۔ اس دفعہ تو میں رسالے کے

پیسے نہیں لوں گی۔ یہ میری طرف سے تمہیں گفٹ ہے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے فون بند کر دیا۔ جانے کیوں اس لمحے میرے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ مارسیا کو اتنی جلدی ٹیلی فون بند نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ مجھ سے مزید باتیں کرتی۔ میں زیادہ دیر تک اس کی آواز سنتا۔ خدا جانے میرے دل میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوئی تھی۔ حالانکہ مجھے مارسیا سے محبت وغیرہ بالکل نہیں تھی۔ اس قسم کا خیال بھی میرے دل میں کبھی نہیں آیا تھا۔ میں نے اس آرزو کو ذہن سے جھٹک کر نکال دیا اور رسالے کا مطالعہ کرنے لگا۔ میں نے مارسیا سے کہا تھا کہ میں رسالے کی قیمت ادا کرنے دوپہر کے بعد اس کی دکان پر آؤں گا۔ مگر اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ کیونکہ مارسیا نے قیمت ادا کر دی تھی اور مجھ سے پیسے لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن جب دوپہر کو میں کینٹے ٹیریا میں کھانا کھانے کے بعد یونیورسٹی کے وسیع و عریض باغ کی ایک روش پر سائپرس کے درخت کے نیچے بنچ پر بیٹھا سستا رہا تھا تو میرے کانوں میں مارسیا کی آواز آئی۔

"سینور! دکان پر آپ ضرور آئیں مگر قیمت ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔"

مجھے بے اختیار حبیب جالب کی غزل کا ایک مصرعہ یاد آ گیا۔

پھر دل سے آ رہی ہے صدا اس گلی میں چل

میں اس وقت کی اپنی جذباتی کیفیت پر ہنس دیا۔ ایسی بات نہیں ہے کہ میرا دل محبت کے جذبات سے خالی تھا۔ ایک دوبار میں اس گلی میں سے گزر چکا تھا لیکن اصل بات یہ ہے کہ میرے دل پر میرے ذہن کا غلبہ ہے۔ میرے دل کی باگ ہمیشہ میرے دماغ کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بری بات نہیں ہے۔ یہ اچھی بات ہے۔ کم از کم میرے لئے یہی بات اچھی ہے۔ میں نے مارسیا کے پاس جانے کا خیال دل سے نکال دیا اور آنکھیں بند کر کے لاہور میں اپنے گھر کے بارے میں سوچنے لگا۔

ایک جیٹ ہوائی جہاز شور مچاتا میرے اوپر سے گزر گیا۔ اس کے شور سے میرے تصورات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں اٹھا اور واپس یونیورسٹی کی طرف چل پڑا۔ ابھی میرا ایک لیکچر رہتا تھا۔ لیکچر ختم کیا تو دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے۔ میں نے رسالہ بریف کیس میں رکھا اور یہ سوچ کر اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا کہ وہاں جا کر اطمینان سے اپنی پسند کا مضمون پڑھوں گا۔ فلیٹ میں آ کر میں نے کافی بنا کر مگ پلنگ کے پاس تپائی پر رکھا اور لیٹ کر رسالہ پڑھنے لگا۔ پیچھے جو گلی تھی وہاں سے دو اطالوی عورتوں کی اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ایک عورت نے قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ فضا خوش ہوئی تو میرے کانوں میں ماریا کی آواز آئی۔ یہ آواز اس بار سرگوشی میں تھی جیسے وہ بڑے رازدارانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

"دوپہر کے بعد ضرور آنا۔ میں انتظار کروں گی۔"

میں نے کافی کا گھونٹ پیا۔ مگ تپائی پر رکھا۔ رسالہ بند کر کے بستر پر پھینکا اور اٹھ کر سیدھا غسل خانے میں گھس گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر بالوں کو اچھی طرح سے سنوارا۔ دوسرے کپڑے پہنے۔ فلیٹ کا دروازہ لاک کیا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر آ گیا۔

میرے قدم اپنے آپ قدیم رومن عمارتوں والے چوک کی طرف اٹھ رہے تھے۔ چوک میں ٹریفک جاری تھی۔ مگر یہ چوک اتنا بڑا تھا کہ میں چلتی ٹریفک میں بھی بڑی آسانی سے چوک عبور کر کے ڈاؤن ٹاؤن کو جاتی سڑک پر نکل آیا۔ یہاں سے سڑک کا نشیب شروع ہو جاتا تھا۔ چوک کے کونے پر ایک چھوٹا سا بورڈ باہر کو نکلا ہوا تھا جس پر انگریزی میں پرانا بکس لکھا تھا۔ اس دکان کے قریب پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئی ہیں۔

چھوٹے چھوٹے پتھروں کے بنے ہوئے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے میں عینکوں کی دکان کے شوکیس کے ساتھ لگ کر رک گیا۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکن کا

جائزہ لیا۔ دل کی دھڑکن معمول پر آ گئی تھی۔ مگر میرا دل زور زور سے کیوں دھڑکنے لگا تھا؟ میں نے سوچا۔ اس خیال پر کہ کہیں مجھے ماریا سے محبت تو نہیں ہو گئی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے اپنے جذبات اور ذہنی کیفیات کا جائزہ لیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرے دل کے ایکدم تیز تیز دھڑکنے کی وجہ محبت نہیں بلکہ ایک قسم کا خوف تھا یا کسی خوف کا احساس تھا۔ میں نے فوراً دل کو اپنے دماغ کے حوالے کر دیا اور ماریا کی دکان کی طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔

ماریا نے مجھے دکان میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ کاؤنٹر پر کسی کے ساتھ ٹیلی فون پر بات کر رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اپنے سر کو ذرا سا جھکا دیا۔ جب میں اس کے کاؤنٹر پر پہنچا تو وہ اس دوران ٹیلی فون بند کر چکی تھی۔ ہنس کر کہنے لگی۔

"سینورا پلیز مجھ سے رسالے کی قیمت کی بات نہ کرنا۔"

میں نے اپنے دل کا جائزہ لیا۔ سب خیریت تھی۔ دل معمول کے مطابق دھڑک رہا تھا۔ بس اسی طرح دھڑکتے رہنا۔ میں نے اپنے دل کو حکم دیا۔ میں کوئی رانجھا یا مجنوں نہیں ہوں۔ میں نے جیب سے بٹوہ نکالا کہ رسالے کے پیسے کم از کم پیش ہی کر دوں۔ یہ میرا اخلاقی فرض بھی تھا۔ ابھی میں بٹوہ کھول ہی رہا تھا کہ ماریا نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ماریا کا ہاتھ گرم تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میرا ہاتھ ٹھنڈا تھا۔ ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ ماریا نے کہیں یہ نہ سوچا ہو کہ روایتی عاشقوں کی طرح اس کے سامنے آنے سے میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔ میں نے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔

"آج سردی ہے۔"

حالانکہ اس روز موسم خوشگوار تھا اور رات بھر جو ٹھنڈی ہوا چلتی رہی تھی اس کا زور ختم ہو چکا تھا۔ پھر میں فوراً اصل موضوع پر آ گیا۔

"نہیں نہیں سینوریتا ماریا! یہ پیسے رکھ لو۔ میں تم پر بوجھ نہیں ڈالنا

چاہتا۔"

ماریا کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ وہ کاؤنٹر پر بے ترتیبی سے پڑی کتابوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"سینورا! میں رسالے کی قیمت وصول نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔"

اور وہ کتابوں کو سمیٹنے میں مصروف ہو گئی۔ میں کچھ کھسیانا سا ہو کر مسکرانے اور ہاتھوں کو زور زور سے رگڑنے لگا۔

"تھینک یو تھینک یو سینورینا۔"

اس کے بعد ماریا نے میری طرف توجہ نہ دی۔ وہ ایک خاتون سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر اس کو شیلف میں سے کتابیں نکال کر دکھانے لگی۔ میں چپکے سے وہاں سے چل دیا۔ اپنے فلیٹ تک میں یہی سوچ سوچ کر دل میں شرمسار سا ہوتا رہا کہ میں نے ماریا کے ساتھ ضرورت سے زیادہ تکلف کیوں کیا؟ مجھے اس سے ملنے کا کوئی بہانہ چاہیے تھا تو یہ کہہ دیتا کہ ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا تمہارا شکریہ ادا کرتا چلوں۔ مگر تم جانتے ہو کہ ہم لوگ کچھ زیادہ ہی جھوٹ بولتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہمارا جھوٹا رکھ رکھاؤ اور تکلفات جھوٹ کی سرحدوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اب مجھے ایک پچھتاوا سا لگ گیا۔ ضمیر میں ایک خلش سی چبھنے لگی۔ بار بار یہ خیال آتا کہ ماریا پر میرا اثر کچھ اچھا نہیں پڑا۔ وہ میرے بارے میں' پاکستانیوں کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔ کہ پاکستانی اس قسم کے بناوٹی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے رسالے کی قیمت ادا کرنے کے لئے یونہی بٹوہ کھول دیا تھا۔ اصل میں مجھے معلوم تھا کہ ماریا رقم نہیں لے گی اور میں رقم ادا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ میری منافقت تھی یا اسے تم ہپوکریسی کہہ سکتے ہو۔ یہ ہپوکریسی ہمارے پاکستانی معاشرے کی رگوں میں دوڑتی پھر رہی ہے۔ ہم روز اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں اور کبھی دل میں خلش تک محسوس نہیں کرتے۔ مگر ماریا ایک صاف

شفاف ضمیر والی لڑکی تھی اس کے آگے میں نے ایسی حرکت کی تو مجھے اس ہپوکریسی کا زیادہ احساس ہوا اور میرے ضمیر نے بھی ہلکی سی ملامت کی۔

میرے دل میں ابھی تک ماریا کے لئے محبت وغیرہ کے جذبات پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بس میں اپنے ضمیر کی خلش مٹانے اور اس کے دل میں پاکستانیوں کے بارے میں جو تاثر پیدا ہو چکا تھا اسے دور کرنے کے لئے ملنا چاہتا تھا۔

مجھے بہت جلد ایک سنہری موقع مل گیا۔ ایک ہفتے بعد یوم پاکستان تھا۔ میں نے یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں اس قومی تقریب کو منانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس تقریب میں روما یونیورسٹی کے پروفیسروں اور میرے چند ایک پاکستانی دوستوں اور ان کی فیملیوں نے شرکت کی۔ ماریا کو میں نے خاص طور پر خود جا کر دعوت دی۔ وہ بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔

"پروفیسور! میں ضرور آؤں گی۔"

تقریب سادہ مگر بڑی پروقار تھی۔ روم میں مقیم میرے دوست اور ان کے بیوی بچے خاص پاکستانی لباس پہن کر آئے تھے۔ کچھ خواتین سندھی لباس میں ملبوس تھیں۔ کچھ نے پنجابی اور پٹھانی لباس پہن رکھا تھا اور کچھ بلوچی عورتوں کے روایتی لباس میں تھیں۔ میرے کچھ دوست بھی سندھی' پٹھانی' پنجابی اور بلوچی لباس میں آئے تھے۔ پاکستان کے ملی گیت بچوں نے مل کر گائے۔ میں نے پاکستان کے قیام کی اہمیت اور اس کے سیاسی پس منظر پر ایک تقریر کی۔ یہ تقریر اطالوی زبان میں کی تاکہ وہاں کے دانشور پوری طرح سمجھ جائیں کہ پاکستان کا قیام کیوں ضروری تھا۔ کیفے ٹیریا میں قائداعظم کی ایک تصویر میں نے اپنے ایک دوست کے گھر سے منگوا کر لگا رکھی تھی۔

ماریا اس تقریب سے بڑی متاثر ہوئی۔ پاکستان کے مختلف صوبوں کے کلر فل لباسوں اور پاکستانی خواتین نے بھی اسے بڑا متاثر کیا۔ مجھے کہنے لگی۔

"سینورا ——

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ماریا! تم مجھے پروفے سور کہا کرو۔ تمہارے منہ سے مجھے یہ لفظ اچھا لگتا ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔

"ہاں تو پروفیسور! پاکستان بڑا کلر فل ملک ہے۔ تمہارے ملک کی خواتین بڑی خوبصورت اور خوش اخلاق ہیں۔"

"اور پاکستانی مردوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ماریا نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

"پاکستانی اپنے ملک سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ اس لئے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ جن لوگوں کو اپنے ملک سے محبت نہیں ہوتی۔ ان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔"

اس کے ہاتھ میں ٹھنڈے کوکا کولا کا گلاس تھا۔ ہم باتیں کرتے اونچی محراب دار کھڑکی کے پاس آ گئے۔ ماریا کھڑکی کے شیشے میں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ دور عمارتوں کے پیچھے سینٹ پال کے گرجے کا گنبد کا اوپر کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"یہ شہر بھی ایک ملک تھا۔ یہ ملک میرا اور میرے اجداد کا ملک ہے۔ آج سے سینکڑوں برس پہلے میرے آباؤاجداد یہاں آئے تھے۔ اس وقت یہاں لومبارڈوں کی حکومت تھی۔ روما کی سلطنت مقدس سلطنت تھی۔ اس زمانے میں یہ سلطنت مذہب اور سیاست میں تقسیم ہوگئی۔ یہ دونوں طاقتیں اپنی اپنی جگہ پر بڑی مضبوط تھیں۔ یہ خانہ جنگیوں کا دور تھا۔"

ماریا نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

"خانہ جنگی بعض ملکوں کی قسمت میں لکھ دی گئی ہے۔ ایسے ملکوں

میں میرے ملک کا بھی ایک صدی پہلے تک یہی حال تھا۔"

یونیورسٹی کا فزکس کا اطالوی پروفیسر آرتھرورک ہمارے پاس مسکراتا ہوا آیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"پروفیسور اشفاق! میں ایک بار پھر تمہیں تمہارے ملک پاکستان کے یوم آزادی پر مبارک باد دیتا ہوں۔ تمہارا قائداعظم ایک گریٹ لیڈر تھا اور تمہاری قوم ——"

وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہو گیا۔ جیسے اسے الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ پھر چٹکی بجا کر انگلی کا اشارہ میری طرف کر کے بولا۔

"تمہاری قوم مارشل قوم ہے۔ تم قدیم رومن قوم کی طرح بہادر قوم ہو۔"

وہ ماریا کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اس سے تعارف چاہتا ہو۔ میں نے ماریا کا تعارف کرایا تو اس نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ماریا سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

"تمہاری دکان پر گیلیلو گیلی پر لکھی ہوئی وینزیو چیلانی کی کتاب تو ضرور ہوگی۔"

ماریا نے کہا۔

"میرا خیال ہے ضرور ہوگی۔"

"اوکے۔" پروفیسر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں کسی روز ضرور آؤں گا۔ تمہاری دکان میں نے دیکھی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں بھی وہاں دیکھا ہے۔"

پھر اس نے مجھ سے دو ایک باتیں کیں اور ماریا کی تعظیم میں ذرا سا سر جھکا کر چلا گیا۔ ماریا کہنے لگی۔

"تمہاری قوم کے بارے میں یورپ میں مشہور ہے کہ اطالیہ کی عورتیں باتیں بہت کرتی ہیں۔ یقین کرو یہاں کے مرد بھی بڑی باتیں

کرتے ہیں۔ باتیں کرنے والی قومیں دل کی بڑی صاف ہوتی ہیں' کشادہ ہوتی ہیں۔ انگریز خاموش رہتا ہے اور وہ کتنا خطرناک ہے اس کا تجربہ تو تم لوگوں کو بہت ہو چکا ہے۔"

ماریا باتیں کرتی مجھے بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں ایک خاص کشش ہے۔ آواز بڑی اہم چیز ہے اے حمید ——— تم بھی ریڈیو کے آدمی ہو۔ میں بھی ریڈیو کا آدمی ہوں۔ ہم دونوں آواز کی اہمیت کو بڑی اچھی طرح سے سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر عورت کی آواز کا ایک بالکل الگ اثر ایک بالکل الگ سائیکالوجی ہوتی ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ ماریا کی مسکراہٹ میں ایک خاص بات تھی۔ وہ خاص بات یہ تھی کہ مسکراتے وقت وہ اپنے خوبصورت ناک کو تھوڑا سکیڑ لیتی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ ایسا جان بوجھ کر کرتی ہو۔ ہو سکتا ہے یہ خود بخود ہوتا ہو۔ بہرحال یہ بات مجھے اچھی لگی اور اس کا بھی مجھ پر اثر ہوا۔

میں نے اشفاق سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اس سے محبت ہو گئی تھی۔"

نہیں نہیں ایسی بات نہیں تھی۔ کم از کم اس وقت تک نہیں تھی۔ بعد میں ایسا ضرور ہو گیا تھا۔ اسی لئے میں تمہیں یہ داستان حنزل بہ حنزل سنا رہا ہوں۔ بس تم سنتے جاؤ۔ بیچ میں بولو مت۔ نہیں تو میں بھول جاؤں گا اور میں تمہیں پوری تفصیل کے ساتھ یہ داستان سنانی چاہتا ہوں۔ یہ ویو داس کی طرح کوئی اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں ہے۔ ماریا ابھی اطالیہ میں زندہ ہے۔ اگرچہ ہسپتال میں ہے اور اس کی یہ حالت میرے غم میں نہیں ہوئی۔ پھر بھی اس داستان میں ایک ہلکی پھلکی اداسی سی ہے جو مجھے پسند ہے اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں بھی پسند آئے گی۔ تو میں تمہیں روما یونیورسٹی میں ماریا سے اپنی پہلی تفصیلی ملاقات کا حال سنا رہا تھا جب میں نے وہاں یوم آزادی پاکستان کی تقریب پر اسے بلایا ہوا تھا۔ یہ تو مجھے اس کی گفتگو سے پتہ چل ہی گیا تھا کہ

اس کا تعلق روم کے ایک قدیم خاندان سے تھا جو صدیوں سے وہاں آباد تھا مگر جس کا جاہ و چشم وقت کی دست برد سے ختم ہو چکا تھا۔ میں نے یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ماریا کا رجحان شہنشاہیت پرستی کی طرف ہے اگرچہ شہنشاہیت کو روم میں ختم ہوئے ایک مدت گزر چکی تھی۔ اس اعتبار سے وہ مسولینی کو پسند کرتی تھی۔ اگرچہ اس کا اظہار اس نے دبی زبان میں ہی کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگ ختم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور اٹلی میں مسولینی کی فاشسٹ پارٹی کا ذکر نفرت سے کیا جاتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ مسولینی نے ملک کو تباہ کر دیا اور اس کو جرمنوں کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔

ماریا سے میری یہ ملاقات یادگار ملاقاتوں میں سے ہے۔ اس ملاقات میں ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ جب میں ماریا کو رخصت کرنے کیلئے میریا کی لابی تک آیا تو میں نے اس سے اس کی رہائش کے بارے میں پوچھا۔ ماریا مسکرا دی۔ کہنے لگی۔

"میں اپنے آباؤ اجداد کے محل میں رہتی ہوں۔ تم آؤ گے تو تمہیں اپنے محل کی شہ نشیں اور تاج و تخت دکھاؤں گی۔"

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"مگر مجھے تو پتہ ہی نہیں کہ یہ محل کہاں ہے؟۔"

ماریا نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"میرا شاہی رتھ تمہیں لینے آئے گا۔"

اور وہ مسکراتی ہوئی ہاتھ ہلاتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ ماریا کو رخصت کرنے کے بعد میں دوسرے مہمانوں سے باتیں کرنے اور ان کی خاطر مدارت میں لگ گیا۔

ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ مجھے ماریا کا ہر دم خیال رہنے لگا ہو یا اس کے ساتھ عاشقانہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہو۔ ہفتے میں ایک آدھ بار اس کا فون آ جاتا۔ رسمی سی بات چیت ہوتی۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ

وہ مجھے ایک پسندیدہ دوست کی طرح اچھی لگنے لگی تھی اور جب اس کا فون آتا یا کسی روز اس سے مختصری ملاقات ہو جاتی تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔

ایک روز اس کا فون آیا۔ کہنے لگی۔

"آج تم میرے محل میں میرے ساتھ چائے پیو گے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"تمہارا رتھ کس وقت مجھے لینے آئے گا۔"

دوسری طرف سے مجھے ماریا کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ کہنے لگی۔

"میں خود رتھ لے کر آؤں گی۔ تمہیں شام پانچ بجے کہیں جانا تو نہیں؟"

میری وہ شام خالی تھی۔ خالی نہ بھی ہوتی تو ماریا ایسی خاتون کے لئے میں اپنی دیگر مصروفیات منسوخ یا ملتوی کر دیتا۔ میں نے کہا۔

"نہیں! آج اتفاق سے میری شام بالکل خالی ہے۔"

دوسری طرف سے ماریا نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

"میں ٹھیک پانچ بجے تمہاری یونیورسٹی میں آجاؤں گی۔"

اس وقت دوپہر کے شاید دو اڑھائی بجے تھے۔ اب خدا جانے کیوں مجھے اس کا انتظار لگ گیا۔ بار بار ماریا کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ تم اسے چاہیے دوستی کہہ لو چاہے محبت کہہ لو۔ بہرحال میں بڑی بے چینی کے ساتھ شام کے پانچ بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک پانچ بجے میں یونیورسٹی کے پورچ کی محراب کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں وقت کی بڑی پابندی کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک منٹ بھی نہیں گزرا ہو گا کہ ایک ٹیکسی گیٹ میں داخل ہوئی اور ایک طرف جا کر رک گئی۔ ماریا ٹیکسی سے نکل کر میری طرف آئی۔ میں بھی مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ اس وقت بھی میرا ہاتھ ماریا کے ہاتھ کے مقابلے میں تھوڑا تھوڑا ٹھنڈا تھا۔ یہ بات مجھے اچھی نہ لگی۔ کیا میں نروس تھا؟ ماریا کے

ساتھ میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی شہر کی کشادہ سڑکوں والے علاقے سے نکل کر دریائے ٹائبر کے ساتھ ساتھ چلتی پرانے زمانے کی دیوہیکل عمارتوں والی بستی میں داخل ہو گئی۔ یہ نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ گلیاں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ چنانچہ ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی تھی اور پتھریلی گلیوں میں پیدل چل رہے تھے۔ میں نے ماریا سے مذاقاً" پوچھا۔

"تمہارا محل ابھی تک نہیں آیا۔"

وہ ہنس دی۔ بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"وہ سامنے میرا محل ہے۔"

یہ ایک دو منزلہ قدیم رومن حویلی تھی جس کی ڈیوڑھی کے آگے دونوں جانب سنگ مرمر کے چبوترے بنے ہوئے تھے۔ گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔ مکانوں کے اندر سے عورتوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ حویلی کی ڈیوڑھی میں دو اونچے ستون تھے۔ جن پر ایک بیل چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہاں مرطوب ٹھنڈک تھی۔ ڈیوڑھی میں سے ایک نیم تاریک زینہ دوسری منزل کو جاتا تھا۔ ماریا دوسری منزل کے ایک کمرے میں رہتی تھی۔ یہ کمرہ کافی بڑا تھا۔ چھت اونچی تھی۔ دو لمبی کھڑکیاں تھیں جو گلی میں کھلتی تھیں۔ ان پر پردے گرے ہوئے تھے۔ ماریا نے ایک کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ پھر بھی کمرے میں روشنی نہ ہوئی تو اس نے بتی جلا دی۔ پردہ ڈال کر کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہوا تھا۔ ایک حصے میں ڈائننگ ٹیبل لگی تھی۔ ساتھ ہی ایک پرانا صوفہ سیٹ پڑا تھا جس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ دوسری طرف پردے کے پیچھے ماریا نے اپنا بیڈ لگایا ہوا تھا۔ کچن زینے کے پاس ہی تھا۔

جس چیز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہ اس کمرے میں لگی ہوئی دو چار پرانی روغنی تصویریں اور نوادرات تھے۔ دیوار پر ایک جگہ ڈھال اور تلواریں لگی تھیں۔ کونے میں ایک پرانے زمانے کے نیزے کے اوپر سرخ ریشمی ربن بندھا ہوا تھا۔ میزوں اور کارنس پر تانبے کے پرانے منقش پیالے تھالیاں اور

ایک گلدان پڑا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ مارسیا نے جو ایک معمولی سی جاب کرتی ہے۔ اتنے قیمتی نوادرات کہاں سے اکٹھے کر لئے ہیں۔ جب میں نے اس بارے میں سوال کیا تو وہ میز پر چائے کا سامان لگاتے ہوئے ہنسی اور کہا۔

"یہ سب اصل کی نقل ہے۔ صرف وہ جو کارنس کے درمیان میں تانبے کا گلدان ہے وہ اصلی ہے اور ہمارے خاندان میں اب تک چلا آ رہا تھا۔ میرے والد اسے بھی بیچنے لگے تھے کہ میں اسے لے کر دوسرے شہر اپنی ایک سہیلی کے پاس چلی گئی۔ اس طرح میں نے اپنے پوڈسٹا خاندان کی اس آخری نشانی کو بچالیا۔ اس کے عوض مجھے بھاری رقم کی پیشکش بھی ہوئی ہے مگر میں نے اسے فروخت نہیں کیا۔"

میں دیوار پر لگی آئیل پینٹنگز کو دیکھنے لگا۔ ان میں ایک تصویر اٹلی کے ایک ماسٹر پینٹر کی بنائی ہوئی تھی۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا کہ مارسیا کی پیچھے سے آواز آئی۔

"یہ پینٹنگ بھی اصل کی نقل ہے۔ اس قسم کی تصویریں یہاں عام مل جاتی ہیں۔"

کارنس کے کونے میں چھوٹے سائز کی ایک رنگین تصویر بھی ہوئی تھی۔ یہ بڑی بڑی مونچھوں اور بھری ہوئی داڑھی والے ایک بوڑھے شخص کا پورٹریٹ تھا۔ جس نے سر پر خود پہن رکھا تھا۔ اس تصویر کے رنگ پھیکے پڑ چکے تھے اور جگہ جگہ خراشیں اور لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے مارسیا سے اس تصویر کے بارے میں پوچھا تو وہ میرے قریب آگئی۔ کہنے لگی۔

"یہ شارل آنشو پوڈسٹا میرے دادا کے والد کا پورٹریٹ ہے۔ یہ حویلی ان کے دادا نے بنوائی تھی۔ بارہویں صدی عیسوی میں جب فریڈرک بار باروسا شہنشاہ بنا تو وہ امراء اور روساء جو بغاوت کے زمانے میں شہر سے باہر اپنے اپنے قلعوں میں چلے گئے تھے۔ واپس

شہروں میں آگئے۔ یہاں انہوں نے اپنے لئے مکانات اور حویلیاں بنوالیں اور یہیں رہنے لگے۔ ان میں زیادہ تعداد گی بے لین امراء اور جنگ جو شاہ سواروں کی تھی۔ میرے جد امجد کا تعلق بھی شہنشاہیت پسند گی بے لین امراء کے طبقے سے تھا۔ گی بے لین جماعت کو بادشاہ کی حمایت حاصل تھی۔ میرے دادا کے دادا اسی شہر کے ناظم مقرر ہوئے۔ شہر کے ناظم کو پوڈسٹا کہا جاتا تھا۔ چنانچہ ہمارا خاندان پوڈسٹا خان کے نام سے مشہور ہوگیا۔ مگر میں اپنے نام کے ساتھ پوڈسٹا نہیں لکھتی۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "اگر تم شہنشاہیت پرست ہو تو پھر اس کا اعلان کرنے میں کیا حرج ہے؟"

مارسیا نے براؤن کلر کا ایک چھوٹا سا کیک خود بنایا ہوا تھا۔ اس کے اوپر کریم سے سفید پھول بنا ہوا تھا۔ وہ کیک کا ٹرے میز پر رکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں اس نام کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتی۔ میں اطالیہ کے ایسے کئی خاندانوں کو جانتی ہوں جو حقیقت میں پوڈسٹا نہیں ہیں مگر اپنے ساتھ پوڈسٹا ضرور لکھتے ہیں۔"

وہ میز کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور کیک کے اوپر جو کریم کا سفید پھول بنا تھا اس کی طرف چھری سے اشارہ کر کے بولی۔

"جانتے ہو میں نے یہ سفید پھول کیوں بنایا ہے؟ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ تیرھویں صدی عیسوی کے شروع میں ہمارا ملک خوفناک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ دو سیاسی جماعتیں بن گئی تھیں۔ ایک جماعت گو یلف کہلاتی تھی اور دوسری جماعت گی بے لین۔ پہلی جماعت عام شہریوں اور مزدوروں، محنت کشوں کی جماعت تھی۔ جبکہ دوسری جماعت کا تعلق امیر طبقہ کے لوگوں، جنگ جو روساء

اور شاہ سواروں سے تھا۔ میرے جد امجد بھی گی بے لین تھے۔ ان دونوں جماعتوں کی آپس میں اس قدر دشمنی تھی کہ انہوں نے اپنی ہر شے دوسری جماعت سے الگ کر رکھی تھی۔ مثلاً اگر گوبلت جماعت کے لوگ سڑک پر بائیں ہاتھ کو چلتے تھے تو گی بے لین جماعت والے دائیں ہاتھ چلتے تھے۔ گوبلت جماعت والوں نے اپنا نشان سرخ گلاب بنایا تھا۔ جبکہ گی بے لین جماعت والوں نے سفید گلاب اپنا نشان منتخب کیا تھا۔ اب وہ لوگ نہیں رہے۔ تاریخ نے ان دونوں جماعتوں کو ختم کر دیا ہے۔ مگر میں اپنے اجداد کی خاندانی روایت کو نبھاہ رہی ہوں۔"

مارسیا چائے بنا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی جا رہی تھی اور اپنے خاندان کا تاریخی پس منظر بیان کر رہی تھی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ اس عورت کو جس کی عمر پچیس چھبیس سال سے زیادہ نہیں تھی اپنے خاندان کے نام و نسب سے کس قدر محبت تھی۔ اسے اپنے خاندان کے ریفرنس سے اطالیہ کی سات آٹھ سو سالہ خانہ جنگیوں اور سیاسی منافرت کی پوری تاریخ یاد تھی۔

اس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ اصل میں شہنشاہیت اور پاپائے روم کی جنگ تھی۔ یہ منافرت کا زہر تھا جو صدیوں تک اطالیہ کے خون میں گردش کرتا چلا گیا۔ ہمارے سب سے بڑے شاعر دانتے کے خاندان کا تعلق دوسری جماعت سے تھا مگر اس کا دل ہمارے جد امجد کی جماعت گی بے لین کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ کیونکہ دانتے خود شہنشاہیت کا حامی تھا۔ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ ایک حاکم اعلیٰ ہی ملک میں امن قائم رکھ سکتا ہے۔"

میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے مارسیا سے پوچھا۔

"کیا تم بھی یہی سمجھتی ہو؟"

وہ خاموش نگاہوں سے مجھے تکنے لگی۔ پھر بولی۔

"ہاں! میں بھی ایک حاکم اعلیٰ کی قائل ہوں۔ جمہوریت نے ہمیں بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ جمہوریت کے ہاتھوں اطالیہ کی شہری ریاستوں کی تاریخ ہر دور میں ہمیں خون آلود نظر آتی ہے۔"

"پھر تو مسولینی ضرور تمہارا ہیرو ہو گا۔"

"تم نے ٹھیک کہا پروفیسر!" مارسیا مسکراتے ہوئے بولی۔ "اطالیہ کو صدیوں بعد ایک ہیرو ملا تھا جس نے فریڈرک دوئم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اطالیہ کو ایک متحد قومیت دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ سلطنت روم کی قدیم شان و شوکت کو پھر سے زندہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر افسوس کہ مسولینی میں فریڈرک ثانی کا جذبہ تو ضرور تھا مگر اس جیسی سیاسی بصیرت اور کشادہ دلی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس قوم کی سربلندی کے لئے وہ اٹھا تھا اسی قوم نے اسے گولیاں مار کر اس کی لاش بجلی کے کھمبے کے ساتھ لٹکا دی۔"

چائے ویسی ہی تھی جیسی یورپ میں ہوا کرتی تھی۔ یعنی ہلکی اور لطیف ——— بے حد لطیف ——— ہاں مارسیا نے جو کیک بنایا تھا وہ بڑا مزیدار تھا۔ اطالیہ والوں پر عربوں خاص طور پر شمالی افریقہ کے مسلمانوں کے کلچر کا بہت اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کھانوں میں گرم مصالحوں کا امتزاج یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں نمایاں نظر آتا ہے۔ میں نے مارسیا سے کہا۔

"اس کا مطلب ہوا کہ تم تو بڑی امیر عورت ہو۔ یہ ساری حویلی تمہاری ملکیت میں ہوگی۔"

مارسیا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہنے لگی۔

"کبھی اس محلے کی آدھی حویلیاں ہماری تھیں۔ میرے دادا نے بڑی جائیداد چھوڑی تھی۔ مگر میرے باپ نے اسے عیاشیوں میں اڑا دیا۔ ایک ایک کر کے ساری حویلیاں بیچ ڈالیں۔ آخر یہ ایک حویلی

رہ گئی۔ اس کے چار حصے تھے؛ تین حصے بک گئے۔ بس یہ ایک چھوٹا سا کمرہ میرے پاس رہ گیا ہے۔ اس پر بھی میرا بھائی جو فرانس میں ہے اپنا حق جتاتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی کرسمس میں اس کا کارڈ آتا ہے تو اس میں لکھا ہوتا ہے کہ میں اس بار آ کر حویلی کے باقی ماندہ حصے کو بھی فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو، تمہیں میں ایک نیا فلیٹ خرید دوں گا۔"

ماریا خاموش ہو گئی۔ چائے بناتے ہوئے میری طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"سینور! کیا تمہارے ملک میں بھی بھائی اپنی بہنوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں؟ میں نے تو سنا ہے کہ اورینٹ میں خاندان کے افراد یک جان ہو کر رہتے ہیں۔"

میں نے اسے پوری تفصیل سے پاکستانی خاندانوں کے آپس میں روابط اور بہن بھائیوں کے پیار، ماں باپ کے ادب آداب اور بزرگوں کے احترام کے بارے میں بتایا۔ وہ بڑے رشک سے مجھے تکنے لگی۔

"پروفیسور! مجھے تو تمہارے ملک میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ میں اسے جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے مایوس ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔"

○

ایک روز ماریا مجھے اپنے آباؤ اجداد کی قبریں دکھانے قبرستان لے گئی۔ یہ قبرستان اپنی پرانی قبروں کے لئے مشہور تھا اور شہر سے دور ایک پرسکون جگہ پر واقع تھا۔ یہاں بڑی پرانی پرانی قبریں تھیں۔ ایک قبر پر 1301ء کا سن لکھا تھا۔ ساری قبریں شکستہ تھیں۔ ان کی میلیں اور کتبے ٹیڑھے ہو گئے ہوئے تھے۔ ماریا پر قبرستان میں داخل ہوتے ہی گہری خاموشی اور سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ قبروں کا ماحول ہی ایسا تھا کہ میں بھی خاموش ہو گیا تھا۔ وہ مجھے اونچے اونچے درختوں کے درمیان بنی ہوئی ایک قبر پر لے گئی۔ قبر کا کتبہ ایک طرف کو نیچے جھکا ہوا تھا۔ اس پر لکھے ہوئے لاطینی الفاظ بالکل پڑھے نہیں جا رہے تھے۔ جو الفاظ پتھر میں کھودے گئے تھے۔ ان کی سیاہی بھی اڑ چکی تھی اور پتھر کے ساتھ پتھر ہو گئے تھے۔ ماریا نے بتایا کہ یہ اس کے دادا کی قبر ہے۔ اس نے مجھے اپنے دوسرے بزرگوں کی قبریں اور ماں باپ کی قبریں بھی دکھائیں۔ ماں باپ کی قبریں شکستہ حالت میں نہیں تھیں۔ وہ ایک قبر کے چبوترے کے پاس بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ سامنے کی جانب سائپرس کے درختوں میں مسلسل تک رہی تھی۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ اپنے ماں باپ اور خاندان والوں کی یاد میں گم ہے۔ اچانک اس نے ہاتھ سے سائپرس کے درختوں کی طرف اشارہ کیا جیسے کسی کو رکنے کے لئے کہہ رہی ہو۔ میں نے سائپرس کے درختوں کی طرف دیکھا۔ مگر مجھے وہاں کوئی شخص نظر نہ آیا۔ میں نے یونہی پوچھ لیا:

"کون تھا؟"

ماریا کے چہرے پر اداس مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے سر جھکالیا۔ ایک لمبا سانس لیا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

"کیا تم اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ مرنے کے بعد روحیں اپنی قبروں پر آتی ہیں؟"

مجھ سے اتنا اہم سوال اچانک پوچھا گیا تھا۔ میں ماریا کو تکتا رہ گیا۔ کوئی جواب نہ دے سکا۔ ماریا نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا۔

"میں نے روحوں کو اپنی قبروں پر اترتے دیکھا ہے۔ ابھی ابھی ایک روح اپنی قبر دیکھنے آئی تھی۔"

"کہاں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ان درختوں کے پاس۔"

ماریا نے سا پرس کے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ ماریا یا تو حد سے بڑھی ہوئی عقیدت رکھنے والی لڑکی ہے اور یا پھر وہ بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ سا پرس کے درختوں سے نظریں ہٹا کر اس نے میری طرف دیکھا۔

"تم ضرور سوچ رہے ہوگے کہ میں پاگل پنے کی باتیں کر رہی ہوں۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں سا پرس کے درختوں والی روح کو بالکل اس طرح دیکھ رہی تھی جس طرح میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔"

"وہ کس کی روح ہے؟" میں نے پوچھا۔

ماریا ایک دو سیکنڈ خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی۔

"ابھی تک مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ گی بے لین خاندان کے ایک اعلیٰ نسب نوجوان کی روح ہے جو شہسوار بھی تھا اور مطرب بھی تھا۔ اسے مرے ساڑھے چھ سو برس ہو چکے ہیں۔ مگر اس کی روح مجھ سے ملنے آتی ہے۔ کبھی چاندنی رات میں میرے کمرے

میں اور کبھی اس قبرستان میں ——— میں جب بھی اس قبرستان میں آتی ہوں تو اسے معلوم ہو جاتا ہے اور وہ اپنی روح کی شکل میں مجھ سے ملنے اپنی قبر پر آجاتا ہے۔ اس کا نام برونتو ہے۔"

ماریا نے ایک سرد آہ بھری اور بولی۔

"پروفیسر! میں نہیں جانتی کہ تمہاری شخصیت میں ایسی کونسی بات ہے کہ میں نے یہ راز تمہیں بیان کر دیا ہے۔ برونتو کی روح نے مجھ سے وعدہ لے رکھا ہے کہ میں یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ مگر میں نے اس سے بھی وعدہ لے لیا تھا کہ زندگی میں یہ راز کم از کم ایک آدمی کو ضرور بتاؤں گی۔ جانتے ہو اس کی وجہ کیا تھی؟ وجہ یہ تھی کہ میں جانتی تھی کہ میری زندگی میں کبھی نہ کبھی ایک مرد ایسا ضرور آئے گا جس کو میں اپنا ہم راز بناؤں گی اور پروفیسر وہ مرد تم ہو۔"

میں شرمسار سا ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"ماریا! یہ تمہاری مہربانی ہے۔ کہ تم نے مجھے اس لائق سمجھا۔"

ماریا نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ گرم تھا اور ذرا سا کپکپایا کہنے لگی۔

"نہیں سینور! میں نے اپنے دل کا حال تمہیں بیان کیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ مجھے تم سے محبت ہے یا نہیں لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ وہ تم ہی آدمی ہو جس پر میں نے اپنی زندگی کے سب سے پراسرار راز کو ظاہر کرنا تھا اور جس کے لئے میں نے شہسوار برونتو کی روح سے وعدہ لے رکھا تھا ———

جب ہم قبرستان سے نکلنے لگے تو میں نے شہسوار برونتو کی قبر دیکھنے کی خواہش کی جس کی روح بقول ماریا اسے ملنے آتی تھی۔ مگر ماریا نے مجھے سا پرس کے درختوں والی قبر کی طرف جانے سے روک دیا۔ میرے لئے ماریا

ایک پراسرار لڑکی بنتی جا رہی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے سچ ہے اور بروتو کی روح اسے ضرور نظر آتی ہوگی۔ کبھی سوچتا کہ مارسیا ایک نفسیاتی کیس ہے۔ وہ ماضی پرست اور خیالوں میں رہنے والی لڑکی ہے۔ روح کے بارے میں وہ جو کچھ بتاتی ہے اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جب میں نے اپنے اس شبے کو دور کرنے کے لئے اس سے کہا کہ وہ مجھے بھی بروتو کی روح دکھائے تو وہ کہنے لگی۔

"وہ تمہیں نظر نہیں آئے گی۔ روح کو دیکھنے کے لئے اپنے مادی جسم سے باہر نکلنا پڑتا ہے اور تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن تم اپنے جسم میں رہ کر روح کو دیکھتی ہو۔"

مارسیا مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بڑی پراسرار تھی اور ہم قبرستان کے گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ کہنے لگی۔

"یہی تم میں اور مجھ میں فرق ہے۔ میں جب بروتو کی روح کو دیکھتی ہوں اور وہ سائپرس کے درختوں میں دور سے مجھے اشارہ کرتی ہے تو اس وقت میں اپنے جسم کے اندر نہیں ہوتی۔ میں ——— یعنی میری جو روح ہے وہ اپنے جسم سے باہر ہوتی ہے۔"

پھر ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

"سینور! تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے۔"

اس روز میں رات دیر تک مارسیا کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر کافی بنا کر پی اور ٹیلی ویژن پر میوزیکل پروگرام دیکھنے لگا۔ میں نے مارسیا کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ دراصل میں اس قسم کی نفسیاتی الجھنوں کا شکار لڑکی سے اپنے آپ کو دور ہی رکھنا چاہتا تھا۔

لیکن مارسیا نے مجھے اپنی زندگی کا ہم راز بنا لیا تھا۔ اپنی طرف سے وہ مجھے بہت بڑا اعزاز دے چکی تھی۔ جہاں تک میں سوچتا ہوں وہ مجھ سے محبت

کرنے لگی تھی لیکن وہ اپنی محبت کو کسی دوسری روح کے ساتھ منسلک کر رہی تھی۔ اس کی وجہ وہی بہتر جانتی تھی۔ اس دوران مجھے جو اس کے ساتھ تھوڑی تھوڑی محبت ہونے لگی تھی اسے میں نے وہیں روک لیا اور اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ ایک تو ویسے ہی میں محبت وغیرہ کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ یہ میری لائن ہی نہیں تھی۔ دوسرے مارسیا روحوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی تھی جو میری نفسیات کو بھی کسی الجھن میں مبتلا کر سکتی تھی۔ پہلے میں اسے دو ایک فون کر لیا لیتا تھا۔ اب میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ مارسیا برابر مجھے فون کرتی۔ میرا حال پوچھتی اور گھر آ کر کافی پینے کی دعوت بھی دیتی۔ میں کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیتا۔ اس دوران یونیورسٹی میں تعطیلات آ گئیں۔

میں مارسیا کو بتائے بغیر سیر و سیاحت کرنے وینس کی طرف نکل گیا۔ وینس اطالیہ کا وہ شہر ہے جس کی گلیوں میں نہریں بہتی ہیں۔ اس شہر کی تاریخ بھی بڑی دلچسپ ہے مگر اس وقت میں تاریخ کے اوراق نہیں کھولنا چاہتا۔ وینس میں مجھے وائی ایم سی اے کے ہوسٹل میں ایک کمرہ مل گیا۔ میں ناشتہ کر کے ہوسٹل سے نکل جاتا اور چھوٹے چھوٹے جزیروں بلکہ ٹاپوؤں پر بنی ہوئی سنگ مرمر کی حویلیوں اور قدیم مکانوں کی سیر کرتا۔ گنڈولا یعنی کشتی پر بیٹھ کر وینس کی نہری گلیوں کی سیریں کرتا۔ دوپہر کو ہوسٹل واپس آ کر کھانا کھاتا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد پھر نکل جاتا۔

ایک روز دوپہر کا وقت تھا۔ وینس شہر میں بڑی خوشگوار چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں ایک سٹور میں اپنے لئے ایک جیکٹ دیکھ رہا تھا۔ جیکٹ پر پھول کچھ زیادہ ہی بنے ہوئے تھے۔ میں سادہ جیکٹ چاہتا تھا۔ میں جیکٹ کو ہینگر میں لٹکانے کے بعد سٹور کے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ سامنے مارسیا کھڑی نظر آئی۔ میں اسے دیکھ کر واقعی بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ وینس روم سے کافی دور تھا۔ میں حیران ہوا کہ یہ لڑکی یہاں کیسے آ گئی۔ پھر سوچا کہ ہو سکتا ہے اپنے کسی کام سے آئی ہو۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ

کہنے لگی۔

"تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ وینس جا رہے ہو مگر مجھے پتہ چل گیا تھا۔"

میں نے کچھ شرمندہ سا ہو کر کہا۔

"بس جلدی میں پروگرام بن گیا۔ تمہیں اطلاع نہ کر سکا۔ تمہیں یونیورسٹی سے پتہ چلا ہوگا۔"

وہ رازداری کے ساتھ میرے قریب ہو کر بولی۔

"مجھے برونو کی روح نے بتا دیا تھا۔ بس اسی وقت میں بھی تمہارے پیچھے پیچھے یہاں آ گئی۔"

میں کچھ گھبرا سا گیا۔ جتنا میں اس لڑکی سے دور رہنا چاہتا تھا اتنا ہی وہ میرے قریب آتی جا رہی تھی۔ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا۔

"چلو اچھا ہوا۔ اب اکٹھے شہر کی سیر کریں گے۔"

سٹور کے پہلو میں ایک پرانا سا ریستوران تھا۔ ہم وہاں آ کر بیٹھ گئے اور کافی پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ مارسیا پہلے سے سنجیدگی اختیار کر رہی ہے۔ اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی شدید ضرورت کے وقت نمودار ہوتی تھی۔ کافی کا مگ دونوں ہاتھوں میں پکڑے وہ ریستوران کے شیشے والے دروازے کے باہر سڑک پر دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی موجودگی میں عجیب سی الجھن محسوس کر رہا تھا۔ دل یہی چاہتا تھا کہ کوئی بہانہ بنا کر مارسیا سے الگ ہو جاؤں۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ اچانک مارسیا میری طرف متوجہ ہوئی۔ کہنے لگی۔

"سینورا! میں تمہیں اس شہر کی ایک تاریخی یادگار دکھانا چاہتی ہوں۔ کیا میرے ساتھ چلو گے؟"

میں نے سوچا کہ تاریخی یادگاریں تو مجھے دیکھنی ہی ہیں۔ پھر مارسیا کے ساتھ چلنے میں کیا حرج ہے۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

"ضرور چلوں گا۔ یہ کس قسم کی تاریخی عمارت ہے۔ کیا کوئی پرانا محل یا قلعہ ہے؟"

مارسیا نے مگ میز پر رکھا اور ہنستے ہوئے بولی۔

"یہ تمہیں وہاں چل کر بتاؤں گی۔ بلکہ تم خود دیکھ لو گے۔"

ریستوران سے نکل کر ہم فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ جہاں سڑک ختم ہوئی وہاں خلیج ایڈریاٹک کا سمندر شروع ہو گیا۔ مارسیا اور میں وہاں ایک گنڈولا میں سوار ہو گئے۔ گنڈولا یعنی کشتی شہر کی پانی سے بھری ہوئی گلیوں میں چل نکلی۔ ان گلیوں میں ایڈریاٹک سمندر کا پانی تھا۔ دونوں جانب پتھر کے قدیم مکانات تھے۔ ان کی سنگ مرمر کی بارہ دریاں اور گیلریاں ہمارے اوپر جھکی ہوئی تھیں۔ سمندر کا پانی مکانوں کی دیواروں اور سیڑھیوں سے ٹکرا کر ہچکولے کھا رہا تھا۔ ہماری کشتی ایک تنگ گلی میں سے گزر کر دوسری طرف مڑی تو مارسیا نے اطالوی زبان میں ملاح سے کہا۔

"یہاں بائیں طرف کشتی روک دو۔"

وہاں بائیں طرف پانی میں ایک چھوٹا سا پرانا مکان تھا۔ جس کے برآمدے کی آدھی سیڑھیاں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ملاح نے کشتی کو سیڑھیوں کے بالکل ساتھ لگا دیا۔ میں نے سوچا کہ یہ ضرور مارسیا کے آباؤ اجداد کی چھوڑی ہوئی یا فروخت کی ہوئی حویلی ہوگی۔ کیونکہ اس حویلی میں پرانے قلعے یا محل والی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم برآمدے میں آ گئے۔ سامنے حویلی کا ستونوں والا پرانا دروازہ تھا۔ دروازہ لکڑی کا تھا جو تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے مارسیا سے پوچھا۔

"کیا یہ کسی بزرگ کی قدیم خانقاہ ہے مارسیا؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آگے بڑھ کر دروازے کے ایک پٹ کو اندر کو دھکیلا۔ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ اندر ایک کشادہ ڈیوڑھی تھی۔ ڈیوڑھی کے آگے بھی ایک محرابی دروازہ

تھا، جو آدھا کھلا تھا۔ وہاں سے روشنی آ رہی تھی۔ یہ دن کی روشنی تھی۔ دروازے کی دوسری طرف ایک چھوٹا سا صحن تھا جس کے وسط میں ایک فوارہ لگا تھا۔ فوارہ ایک دیوہیکل انسان کے مجسمے کی شکل میں تھا جس کا رنگ نسواری پڑ چکا تھا۔ حوض بھی خشک تھا اور کہیں کہیں گھاس اُگ رہی تھی۔ سامنے پھر ایک ستونوں والا برآمدہ تھا۔ ماریا مجھے برآمدے میں لے آئی۔ پھر اس نے برآمدے کی ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ دروازہ پورا کھلا تو کوٹھڑی میں دن کی روشنی داخل ہو گئی۔ اس روشنی میں مجھے اس چھوٹی سی کوٹھڑی کے وسط میں ایک پتھر کا چبوترہ نظر آیا جس کے چاروں طرف لوہے کے کنڈے لگے ہوئے تھے۔ ماریا محویت کے عالم میں اس چبوترے کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ سے چبوترے کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔

"مجھے اس چبوترے پر لوہے کے کنڈوں سے باندھ کر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ وہ لوگ مسولینی کے حامیوں کو چن چن کر قتل کر رہے تھے۔"

ماریا نے بتایا کہ جب اتحادی فوجیں اٹلی میں داخل ہوئیں تو ہر طرف قتل و خون ریزی کا بازار گرم ہو گیا۔ مسولینی کو گولی مار کر چوراہے میں کھمبے پر لٹکا دیا گیا۔ ماریا نے ایک عقلمندی کی تھی۔ حالات کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے کسی طریقے سے اپنے ماں باپ کو بھائی کے ساتھ یونان بھیج دیا تھا۔ مگر اُسے مخالف پارٹی کے آدمیوں نے پکڑ لیا۔ انہوں نے ماریا کو قتل تو نہ کیا مگر اسے ہر قسم کے تشدد کا نشانہ بنایا۔ وینس میں وہ مجھے ساتھ لے کر خاص طور پر وہ نیم تاریک حویلی والا چبوترہ دیکھنے آئی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہ بڑی دردناک کہانی ہے۔ بہرحال میری زندگی باقی تھی۔ میں بچ گئی۔ یہ چبوترے مجھے ماضی کے عذاب یاد دلاتا ہے۔ میں جب بھی وینس آتی ہوں تو اس چبوترے کو دیکھنے ضرور آتی ہوں۔"

میں تین دن وینس میں ٹھہرا۔ اس دوران ماریا دوسرے شہر جا چکی تھی۔ واپس روم آیا تو اسے فون کیا معلوم ہوا کہ وہ ابھی روم واپس نہیں آئی۔"

یہاں اشفاق احمد کا یا اطالیہ کی ماریا کا رومان ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے ساری داستان سن کر اشفاق سے کہا۔

"یہ بڑی رومانٹک کہانی ہے۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس پر ایک دل کو گداز کرنے والا ناول لکھتا۔"

اشفاق احمد نے بڑے افسردہ تبسم کے ساتھ کہا۔

"تم تو ناول لکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے مگر میں کیا کروں؟"

اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ یہ شخص اندر سے کس قدر حساس اور گداز ہے۔ اسے اس لڑکی کا غم تھا مگر یہ غم اس نے مجھ پر بھی ظاہر نہیں کیا تھا اور اگر اس روز جب اسے ماریا کا خط ملا' میں اس کے پاس نہ بیٹھا ہوتا تو وہ یہ کہانی مجھے کبھی نہ سناتا۔ میں اسے کردار کی ایک خوبی سمجھتا ہوں اور اشفاق احمد میں یہ خوبی موجود ہے۔

- زندگی کے درخت پر تصوف کا پھل عام طور پر عمر کے آخری حصے میں جا کر لگتا ہے۔ نوجوانی کے زمانے میں مجھے نہیں یاد کہ اشفاق احمد نے مجھ سے کبھی تصوف کے موضوع پر کوئی بات کی ہو۔ یہ زمانہ ہنسنے کھیلنے اور موج اڑانے کا ہوتا ہے۔ البتہ درمیانی عمر میں آ کر اشفاق نے تصوف کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ یہ باتیں کسی ایسے سالک کی نہیں تھیں جو حقیقت کی تلاش میں نکلا ہو۔ بلکہ ایسے پیر باصفا کی باتیں ہوتی تھیں جس نے حقائق و معارف کی منزل پا لی ہو۔ نفسیاتی طور پر وہ کسی ایسے پیر کامل کی تلاش میں تھا جو اسے اپنا مرید بنانے کی بجائے پیر کامل بنا دے۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھ لیں کہ اشفاق احمد خود پیر بننا چاہتا تھا۔ میرے سامنے وہ تصوف کی باتیں بہت کم کرتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے اس کے تصوف سے کوئی دلچسپی نہیں ہے

مگر اپنے سے علمی اعتبار سے کم تر اور اپنے ماتحت لوگوں میں بیٹھ کر وہ تصوف پر دقیق قسم کے لیکچر دیتا اور وہ لوگ کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلاتے رہتے جو سر مضبوط نہ ہو وہ بڑی جلدی ہل جاتا ہے۔

مجھے خبر ملتی رہتی کہ آج اشفاق احمد فلاں پیر کے ڈیرے پر گیا ہے۔ آج فلاں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ میں نے کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ کبھی کبھی وہ خود مجھے بتاتا کہ آج میں فلاں بزرگ کے پاس گیا تھا۔ بڑے کمال کا آدمی ہے۔ اس کے ڈیرے پر ہروقت لنگر کھلا رہتا ہے۔ جو کوئی آئے بزرگ بابا جی سب سے پہلے اسے کھانا کھلاتے ہیں۔ میں کہتا۔

"ضرور وہ بڑے نیک دل بزرگ ہیں ان سے فیض حاصل کرو۔"

مجھے معلوم نہیں کہ اشفاق احمد نے کسی بزرگ سے فیض حاصل کیا یا نہیں لیکن وہ بڑے بڑے باصفا بزرگوں کے پاس دوڑ دوڑ کر جاتا رہا ہے۔ کچھ روز کسی بزرگ کی مجلس میں بیٹھتا ہے۔ ہر محفل میں اس کا ذکر کرتا ہے اور پھر اس بزرگ کو چھوڑ کر کسی دوسرے بزرگ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اشفاق احمد کو خود پیر بننے کا شوق ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب اسے کسی پیر کی نہیں بلکہ اپنے مریدوں کی تلاش ہے۔ بہرحال یہ اس کا خالص ذاتی معاملہ ہے۔ ہو سکتا ہے اندر سے وہ پورا صوفی بن چکا ہو اور اس نے حقیقت کو پالیا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی منزل کی تلاش میں ہو۔ ہو سکتا ہے کہ نہ اسے حقیقت سے کوئی دلچسپی ہو اور نہ کسی پیر کامل کی تلاش ہو اور وہ محض تصوف پر باتیں ہی کرنی چاہتا ہو۔ اس کا تصوف محض بحث مباحثے اور تصوف کی اصطلاحوں تک ہی محدود ہو۔

اشفاق کو تصوف کی اصطلاحیں بولنے کا بڑا شوق ہے۔ ایک زمانے میں اس کے منہ پر "تجوہز" کا لفظ بڑا چڑھا ہوا تھا۔ وہ یہ لفظ تصوف کی گفتگو کرتے ہوئے بار بار استعمال کرتا۔ میں نے ایک دن پوچھا۔

"یہ تجوہز کیا چیز ہے؟"

اس پر اشفاق نے مجھے ایک لیکچر دیا۔ میں پہلے ہی پریشان تھا۔ اس کا لیکچر سن کر اور پریشان ہو گیا۔ یہ لفظ "تجوہز" بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔

لاہور شہر سے باہر ایک بزرگ راضی سائیں کا ڈیرا تھا۔ اشفاق احمد، یونس ادیب کے ساتھ ان بزرگ کی خدمت میں اکثر حاضری دیتا تھا۔ ان دنوں وہ ان بزرگ کا ہر مجلس میں ذکر کرتا۔ کہیں کوئی خطبہ صدارت پڑھتا تو اس میں بھی اسی بزرگ کا کسی نہ کسی طریقے سے ضرور ذکر کرتا۔ پھر ایک وقت آیا کہ اس بزرگ کے بارے میں خاموش ہو گیا۔ میں نے بھی اس سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ کیونکہ مجھے اس کی زندگی کے اس پہلو سے کبھی بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے اس کی دوستی عزیز تھی اور آج بھی ہے۔ وہ مجھے اچھا لگتا تھا اور آج بھی اسی طرح اچھا لگتا ہے۔ تصوف سے ہٹ کر وہ جس موضوع پر بھی بات کرے میں اس میں بڑی دلچسپی لیتا ہوں۔ اسے شوق سے سنتا ہوں۔ ایک عجیب بات میں نے اشفاق احمد میں دیکھی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ اپنی زبان سے نہیں بلکہ اپنے عمل کے ساتھ بڑا سنگدلانہ سلوک کرتا ہے۔ میں اس نتیجے پر بھی پہنچا ہوں کہ اشفاق احمد کے اندر ایک اقتدار پسند بیوروکریٹ یعنی شاہی افسر کہیں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ اس شاہی افسر نے نہ تو اشفاق احمد کو پورا ادیب بننے دیا ہے اور نہ پورا صوفی درویش بننے دیا ہے۔ بس وہ تصوف اور ادب کے درمیان لٹک کر رہ گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں اس نقطے کی باربار وضاحت کر چکا ہوں کہ مجھے اس کی دوستی عزیز ہے۔ میں چونکہ محبت کا آدمی ہوں۔ قدرتی طور پر میرے اندر اشفاق احمد کے لئے محبت پیدا ہو چکی ہے۔ اگر میرے دل میں یہ محبت نہ ہوتی تو یقین کریں میں اس کا دوست کبھی بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ جتنی اس کے اندر کمزوریاں ہیں اس سے دگنی میرے اندر کمزوریاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے محبت کا جذبہ عطا کر کے مجھ پر بڑا کرم کیا ہے۔ دوست میں نے جس کو بنایا وہ مجھ سے برگشتہ ہو گیا لیکن محبت جس سے کی ہے پھر وہ میری محبت کے اثر سے بچ نہیں سکا۔ یہی حال

اشفاق احمد کا ہے۔ جب میں اس کے سامنے جاتا ہوں تو اپنی محبت کو اس کے چہرے پر صاف دیکھ لیتا ہوں۔ اس وقت وہ بالکل بدلا ہوا آدمی ہوتا ہے۔ میری محبت اس کے دل کے کسی گوشے میں سوئی ہوئی محبت کو بیدار کر دیتی ہے۔ یقین کریں اس وقت اشفاق احمد دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ دوستیاں کرتے ہیں جس میں دماغ دماغ سے لڑتا ہے۔ محبتیں نہیں کرتے جس میں دل دل کے ساتھ مل جاتا ہے۔ جب بھی اشفاق احمد سے ملتا ہوں تو میرا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ محبت —— محبت —— صرف محبت! نہ کوئی غرض' نہ لالچ' نہ لینا نہ دینا۔ بس دیکھ کے خوش ہو جانا۔ باتیں کرکے خوش ہو جانا۔ جتنی دیر ایک دوسرے کے قریب رہنا خوش رہنا' نہال رہنا۔ کبیرداس نے شاید اسی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

کچھ لینا نہ دینا

مگن رہنا

دوستوں میں اس قسم کی محبت میں نے اشفاق احمد سے پہلے کرم نواز (بعد میں صرف نواز) سے کی ہے اور اشفاق احمد کے بعد کسی سے نہیں کی۔ ہوئی ہی نہیں۔ میں کیا کرتا۔ دوستی کرنا دکان کو سجا کر مال بیچنا ہے۔ محبت کرنا دکان کے مال کو لٹا دینا ہے۔ جیسے جیسے دکان کا مال لٹاتے جاؤ دل کی خوشی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ منافع بڑھتا جاتا ہے۔ دکان خالی ہوتی جاتی ہے۔ دل بھرتا چلا جاتا ہے۔ پچھلے صفحوں میں مَیں نے اشفاق احمد کی جو دو ایک کمزوریاں یا برائیاں بتائی ہیں تو یہ میرے اندر بھی موجود ہیں اور یہ کمزوریاں مجھے محبت میں نظر نہیں آئیں۔ دوستی کی آنکھ سے دیکھا ہے تب نظر آئی ہیں۔ جب سے لوگوں کو پتہ چلا ہے کہ میں اشفاق پر کتاب لکھ رہا ہوں تب سے شمال' جنوب' مشرق' مغرب سے لوگ آ آ کر میرے کان بھر رہے ہیں۔ یہ بھی لکھنا کہ وہ —— یہ بھی لکھنا —— یہ ضرور لکھنا کہ —— جو کوئی میرے پاس آ کر مجھے اس کی کوئی برائی یا کمزوری بتاتا ہے تو میں اسے کہتا ہوں کہ یہ برائی تو

میرے اندر بھی موجود ہے۔ میں کس منہ سے لکھوں؟ اس کی بعض کمزوریاں جو میں نے بیان کی ہیں وہ ایسی ہیں کہ میں اس کے منہ پر بھی کہہ سکتا ہوں۔ ایسی بات نہیں ہے کہ مجھے کتاب لکھنے کا موقع ملا ہے تو میں اس کی عدم موجودگی میں اس کے کچے چٹھے پھولنے شروع کر دوں۔ کون ہے جس میں عیب نہیں ہوتے دیکھنے والی چیز تو یہ ہوتی ہے کہ ایک انسان کے اندر اللہ کی مخلوق کے ساتھ محبت کتنی ہے۔ اشفاق احمد میں لاکھ کمزوریاں سہی' لاکھ اپنے ماتحتوں کے ساتھ ضابطے کی سخت کارروائی کرے' مگر اس کے دل میں اللہ کی مخلوق کے لئے محبت کا بڑا قیمتی سرمایہ موجود ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ "گڈریا" اور "مہمان بہار" ایسی کہانیاں نہ لکھ سکتا۔

کون لکھتا ہے ایسی کہانیاں؟ کون پڑھتا ہے ایسی کہانیاں؟ میں نے ایک دفعہ اشفاق سے کہا تھا۔ کہانیاں لکھ کر بھول جایا کرو۔ مگر وہ نہیں بھولتا۔ اس کے اندر ایک یہ بھی بڑی کمزوری ہے۔ وہ اپنی کہانی کا پیچھا کرتا ہے۔ جہاں جہاں کہانی جاتی ہے اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔

اس زمانے میں جو کہ لاہور میں شعر و ادب کے عروج کا زمانہ تھا مال روڈ پر ایک چھوٹا سا بڑا رومانٹک ریستوران کھلا تھا جس کا نام بھی فرانسیسی میں شالٹ یا شالے تھا۔ اب یہ فرنچ جاننے والے جانیں کہ فرانسیسی میں اس کا تلفظ کیا ہوتا ہے۔ زبان بھی انسانوں کے درمیان ایک حجاب ہے۔ کیسے کیسے حجاب بیچ میں آن پڑے ہیں۔ بہرحال اس ریستوران میں ایک چھوٹی سی شاہ نشین یا ڈبہ نما کمرہ تھا جس کی ایک ہی کھڑکی تھی جو مال روڈ پر کھلتی تھی۔ اس ریستوران میں چائے کی بجائے کافی ملتی تھی اور کافی بھی برازیل کی —— یہ میں سن 1950ء کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت میں نے برازیل کے ملک کو دنیا کے نقشے پر ہی دیکھا تھا اور اس کی کافی ہندوستان کے شہر گوا میں ایک دو بار پی تھی۔ وہاں یہ کافی پرتگالی اپنے ساتھ لائے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ برازیل میں بھی یہ کافی پرتگال کے لوگ ہی لے کر گئے تھے۔ مال روڈ والے شالٹ کی

کافی کم از کم لاہور کے کافی ہاؤس سے بڑی اچھی ہوتی تھی۔ کافی ہاؤس کی کافی بڑی پتلی اور کم تر درجے کی کافی ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کافی ہاؤس میں بیٹھنے والوں میں کافی کا شعور نہ ہونے کے برابر تھا۔ اگر لاہور کے کافی ہاؤس والے ہندوستان کے شہر مدارس میں جا کر وہاں کے دانش وروں کو اپنی کافی پلاتے تو انہیں دوسرے دن ہی بوریا بستر گول کر کے وہاں سے بھاگنا پڑتا۔ کیونکہ مدارس کا قلی بھی ہم سے زیادہ بہتر اور اچھی کافی پیتا ہے اور کافی کا بہتر شعور رکھتا ہے۔ میں چونکہ پاکستان بننے سے پہلے پہلے مدراس، کیرالہ اور گوا، دمن کے ریستورانوں میں بیٹھ کر موسلا دھار بارش کے پس منظر میں وہاں کی کافی اور کوکو پی چکا تھا اس لئے مجھے پہلے روز سے ہی لاہور والے کافی ہاؤس کی کافی پتلی اور غیر معیاری لگی تھی اور سخت مجبوری کی حالت میں وہاں کافی پیتا تھا۔ لاہور والے کافی ہاؤس میں اصلی اور نقلی دانشور محض فیشن کے طور پر کافی پیتے تھے۔ وہ کافی کو بالکل چائے کی طرح پیتے۔ یعنی بیٹھے ہیں اور کافی پر کافی پئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں سوچتا تھا کہ یہ مشروب صرف مرطوب یا سخت سرد ملکوں کے لئے ہوتا ہے۔ چنانچہ کافی ہاؤس کے اکثر دانشوروں نے کافی پی پی کر اپنے معدوں کو تباہ کر دیا۔ ناصر کاظمی کو اس کافی ہاؤس کی کافی پی پی کر معدے کا السر ہوا تھا۔ اگر باہر برف نہ گر رہی ہو اور جنوب مشرقی ایشیا کی موسلا دھار مرطوب موسموں والی بارشیں نہ ہو رہی ہوں تو کافی کے پیالے پر پیالے پئے جانا شراب پینے سے زیادہ خطرناک بات ہوتی ہے۔

میں مال روڈ والے شالٹ ریستوران کی کافی کی بات کر رہا تھا۔ اس ریستوران کا نام صرف شالٹ تھا۔ ریستوران اسے میں نے لکھ دیا ہے۔ یہاں کھانا نہیں ملتا تھا۔ صرف۔ سنیکس تیار ہوتے تھے اور کافی ملتی تھی۔ میں اور اشفاق کبھی کبھی اس ریستوران میں جا کر کافی پیا کرتے تھے۔ وہ سردیاں ہوں یا گرمیاں وہ یہاں میری زیر نگرانی کافی پیتا تھا اور ہم کریم ڈال کر کافی پیتے

تھے۔ ہمارے شہر کے موسموں کے لئے کریم کافی کا لازمی جز ہے۔ جو دانشور ان باتوں کا خیال نہیں رکھتے ان کی دانش پر میں نے کبھی اعتبار نہیں کیا۔

لاہور میں برف تو نہیں گرتی لیکن یہاں سردیوں کی بارش بڑی رومانٹک ہوتی ہے۔ مال روڈ والے فرانسیسی شالٹ میں ہم کوشش کرتے کہ اس وقت کافی پینے جائیں جب بارش ہو رہی ہو۔ خواہ یہ بارش موسم برسات کی بارش ہی کیوں نہ ہو۔ برسات کا موسم جنوبی مشرقی ایشیا کے بانس کے جنگلوں سے شروع ہوتا ہے۔ وہاں وہ جوان اور سرسبز و شاداب ہوتا ہے۔ لاہور تک آتے آتے وہ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ جنہوں نے ملایا، تھائی لینڈ، سنگا پور، رنگون، کلکتہ اور کولمبو کے جنگلوں کی بارشیں دیکھی ہوتی ہیں وہ لاہور اور گوجرانوالہ کی برسات کو دیکھ کر صرف آہیں ہی بھر سکتے ہیں۔

مال روڈ والے شالٹ کے کیبن میں ایک لکڑی کا تنگ زینہ جاتا تھا۔ میں اور اشفاق احمد کیبن کی چھوٹی سی کھڑکی والی میز کے پاس بیٹھ جاتے بارش میں مال روڈ کا نظارہ بھی کرتے اور کریم والی کافی کا بھی مزا لیتے۔ اس وقت ہمیں کوہ مری کا سمیز ریستوران بہت یاد آتا۔ آزاد کشمیر ریڈیو کے زمانے میں ہم نے وہاں برفباری کا ایک سیزن ایک ساتھ گزارا تھا۔ اس وقت پاکستان کی عمر ایک سال سے بھی کم تھی۔ کوہ مری میں اتنی آبادی کہاں تھی۔ گرمیوں میں تھوڑی رونق ہوتی تھی۔ برفباری کے زمانے میں تو بالکل ہی خالی ہو جاتا تھا۔ برفباری میں ہم لمبے گرم کوٹ پہنے چھڑیاں ہاتھ میں لئے گرتی برف میں لمبی لمبی سیر کرتے۔ سمیز ریستوران کے مالک سلطان صاحب نے خاص طور پر ریستوران سردیوں میں بھی کھلا رکھا تھا۔

○

ایک روز کوہ مری میں بڑی زبردست برف گر رہی تھی۔

سارے درخت' مکانوں کی چھتیں' سڑکیں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ سمرنے کے بحری جہاز نما ریستوران کے تمام شیشے والی کھڑکیاں بند تھیں۔ میں اور اشفاق لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر ریستوران میں آگئے۔ باہر سخت سردی تھی۔ برف گر رہی تھی۔ ساتھ ہوا بھی چل رہی تھی جو بڑی یخ آلود تھی۔ ریستوران کی فضا گرم تھی۔ بخاری میں آگ دہک رہی تھی۔ سلطان صاحب حسب معمول اپنی کونے والی سیٹ پر کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔ دور سے ہاتھ کے اشارے سے ہم نے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ ہم دوسرے کونے والی میز پر بیٹھ گئے۔ بند کھڑکی کے شیشوں پر بھاپ جم رہی تھی۔ ہم بار بار رومال سے بھاپ کو صاف کرتے تو سڑک کا منظر صاف ہو جاتا۔ برفباری میں کوئی کوئی مقامی آدمی لاٹھی ٹیکتا سڑک پر سے گزر جاتا۔ ریستوران کے سامنے اونچے ٹیرس پر ایک کوٹھی کے پہلو میں چھوٹی سی انیکسی تھی۔ انیکسی کی ڈھلواں چھت سفید برف میں چھپی ہوئی تھی۔ برآمدہ خالی اور ویران تھا۔ سامنے چھوٹے سے لان میں بھی برف کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ میں اور اشفاق باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ویٹر ہمارے لئے کریم کافی لے آیا۔ اشفاق کافی بنانے لگا۔ میری نگاہیں بار بار ٹیرس والی انیکسی کی طرف اٹھ جاتیں۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ وجہ یہ تھی کہ تھوڑی دیر پہلے میں نے وہاں پر ایک لڑکی کو دیکھا تھا جس نے بلیو شلوار قمیض کے اوپر سرخ رنگ کا ہاف کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر برآمدے میں آئی تھی۔

اس نے چھوٹی سی ٹوکری برآمدے میں ستون کے ساتھ رکھی اور برف کے چھوٹے چھوٹے سفید پھولوں کو گرتے دیکھنے لگی۔ پھر وہ جلدی سے کمرے میں چلی گئی اور کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ انیکسی خالی ہوگی۔ برفباری میں کون پہاڑ پر آتا ہے۔ مگر لڑکی کو دیکھا تو طبیعت خوش ہو گئی کہ دنیا میں باذوق لڑکیاں ابھی باقی ہیں۔ میں نے اشفاق کو نہ بتایا کہ ابھی ابھی میں نے ویران ٹیرس والی انیکسی میں ایک لڑکی کو دیکھا ہے۔ وہ لڑکی لباس سے پڑھی لکھی لگ رہی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ پہاڑ پر برفباری کا نظارہ کرنے آئی ہوئی ہے۔

جس وقت اشفاق نے کافی بنا کر میری طرف بڑھائی تو میں اسی ٹیرس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اشفاق میری نظروں کو پہچان لیتا ہے۔ اس نے بھی ایک نگاہ اوپر خالی ٹیرس پر ڈالی اور پوچھا۔

"ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "برفباری دیکھ رہا ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ "کمینے ضرور کوئی بات ہے۔ کیا وہاں کوئی لڑکی نظر آئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "اس برفباری میں اتنی شدید سردی میں یہاں کون آتا ہے۔"

عین اسی وقت وہی لڑکی دروازہ کھول کر دوبارہ برآمدے میں آئی۔ اس بار اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جو بھاری بدن کی تھی۔ اشفاق فوراً بولا۔

"کمینے میں نہ کہتا تھا کوئی بات ضرور ہے۔"

پھر وہ مجھے ڈانٹنے اور ہدایات دینے لگا۔

"خبردار! جو یہاں کوئی ایسی ویسی حرکت کی۔ ہم لوگ یہاں ایک

نیشنل کاز کے لئے کام کرنے آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں اپنے نیشنل
کاز کی اینگزیٹی کا خیال رکھنا ہوگا۔"
میں نے تنگ آکر کہا۔
"میں نے کسی کا کیس نہیں کاٹا۔ برفباری میں ایک کاسنی لباس
والی لڑکی کو دیکھا ہے جو مجھے اچھی لگی ہے۔"
اشفاق سر ہلانے لگا۔
"شروع شروع میں تم یہی کہا کرتے ہو۔ میں تیری ایک ایک رگ
سے واقف ہوں۔"

میں نے گرتی برف کی جھالر میں سے ٹیرس کی طرف دیکھا۔ وہاں
دونوں عورتوں میں سے کوئی بھی نہیں تھی۔ میں نے اشفاق سے کہا۔
"اب تو خوش ہو۔ برآمدہ خالی ہے دیکھ لو۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔"

اتنے میں سیمز کے مالک سلطان صاحب بھی اٹھ کر ہمارے پاس آگئے
اور سیاست پر باتیں شروع ہو گئیں۔ سیاست سے مجھے ذرا بھی دلچسپی نہیں
تھی۔ اشفاق سیاست پر خوب باتیں کرنے لگا۔ میں اس کی نظریں بچا کر تھوڑی
تھوڑی دیر بعد اوپر انیکسی کے برآمدے کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ مگر وہ کاسنی
سوٹ والی لڑکی پھر نظر نہ آئی۔ ہم کافی دیر ریستوران میں بیٹھے رہے۔ پھر گرتی
برف میں ہی ریستوران کی سیڑھیاں اتر کر سڑک پر آگئے اور واپس اپنے
کواٹروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

برفباری کے سیزن میں مری کی فیشن ایبل سڑکیں خالی خالی تھیں۔ مال
کی دکانیں بھی بند تھیں۔ مگر لوئر بازار میں دکانیں کھلی تھیں۔ یہ مقامی لوگوں
کی دکانیں تھیں۔ سارا دن وہاں مقامی لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میرے
بوٹ کا ایک تسمہ ٹوٹ گیا تھا۔ میں تسمہ لینے لوئر بازار میں ایک پنساری کی دکان
پر کھڑا تھا کہ نیچے سے دو عورتیں اوپر آتی نظر آئیں۔ ان کے لباس سے لگ
رہا تھا کہ وہ مقامی نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک بھاری بدن کی عورت تھی اور

ایک دبلی پتلی لڑکی تھی۔ لڑکی نے کاسنی سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ابھی وہ دور ہی تھیں
کہ میرے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو گئی۔

میرے دل نے کہا۔ یہ کاسنی سوٹ والی وہی ٹیرس والی لڑکی ہے۔ میں
تجھے دیکھنا بھول گیا۔ وہ میرا آوارہ گردیوں اور آوارہ مزاجیوں کا زمانہ تھا۔
سڑک پر برف جمی ہوئی تھی۔ دونوں عورتیں بڑی احتیاط سے چڑھائی چڑھ رہی
تھیں۔ ہوا بند تھی۔ برف نہیں گر رہی تھی۔ جب وہ میرے قریب سے
گزرنے لگیں تو میں لڑکی کے قد کاٹھ اور کاسنی لباس سے اس نتیجے پر پہنچا کہ
یہ وہی ٹیرس والی لڑکی ہے۔

دونوں کے سانس پھول رہے تھے اور وہ کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔
قریب سے گزرتے ہوئے اس لڑکی نے یونہی ایک نظر مجھ پر ڈالی اور دونوں
عورتیں جمی ہوئی برف پر سنبھل سنبھل کر چڑھائی چڑھتیں آگے نکل گئیں۔
میری نگاہ دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ وہی ٹیرس والی لڑکی
ہے۔ اس نے سرخ ہاف کوٹ کی بجائے فل سلیوز اور بند گلے والا گہرا نیلا
سویٹر پہنا ہوا تھا۔

میں انہیں جاتا اوپر دیکھ رہا تھا۔ اوپر پہنچ کر جب وہ ڈاک خانے والے
چوک کی طرف مڑنے لگیں تو کاسنی سوٹ والی لڑکی نے گردن موڑ کر میری
طرف دیکھا اور پھر دوسری عورت کے ساتھ تیزی سے آگے نکل گئی۔ میرے
دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہو گئی۔ وہ نوجوانی کا دور تھا۔ وہ زمانہ ہی دل کی
دھڑکنوں کے شمار کا زمانہ ہوتا ہے۔ آخر عمر میں جا کر پھر آدمی کی دھڑکن
اچانک تیز ہو جائے تو وہ ڈر جاتا ہے اس کا رنگ اڑ جاتا ہے کہ کہیں مجھے
ہارٹ اٹیک تو نہیں ہونے والا۔ جوانی میں دل دوسرے کے دل پر اٹیک کرتا
ہے۔ آخری عمر میں خود اس پر اٹیک ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ جوانی کی
ساری خرمستیاں پھر آخری عمر میں آکر نکلتی ہیں۔ اسی لئے سیانے کہتے ہیں کہ
آدمی جوانی میں اپنے آپ کو سنبھال کر رکھے تو آخری عمر بڑے آرام سے

گزرتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آرام ہے کیا چیز؟ بعض لوگوں کو دل کے درد میں آرام ملتا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ شاعرانہ بات ہے۔ محبت میں جو دل کا درد ہوتا ہے اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اصل دل کا درد جو ہوتا ہے اس سے خدا بچائے۔ آدمی ساری محبت وغیرہ بھول جاتا ہے۔

مگر میری عمر ایسی باتیں سوچنے کی نہیں تھی۔ میں فوراً اس لڑکی پر عاشق ہوگیا۔ میں نے اسے اپنے خیالوں کی محبوبہ بنالیا اور بڑا خوش ہوا کہ چلو یہاں برفباری میں ایک رومانس بھی شروع ہوگیا۔ اس رومانٹک خیال نے ہی میرے وجود کو ایک آسمانی لذت اور روحانی سرور سے لبریز کردیا۔ اب میں ایسے طریقے سوچنے لگا کہ اس لڑکی سے دوبارہ ملاقات کی جائے۔ میں نے اشفاق سے اس کا ذکر نہ کیا۔ دوسرے روز ایسا اتفاق ہوا کہ اس لڑکی سے ایک بار پھر آمنا سامنا ہوگیا۔ کوہ مری کی میونسپل لائبریری بھی برفباری کے سیزن میں اپنے اوقات کے مطابق کھلی رہتی تھی۔ میں لائبریری کی نیم گرم فضا میں بیٹھا ایک رسالہ دیکھ رہا تھا کہ وہی لڑکی لائبریری میں داخل ہوئی۔ میں ایسے زاویے پر بیٹھا تھا کہ اس کی نظر مجھ پر نہ پڑی۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ سیدھی لائبریرین کے پاس جا کر باتیں کرنے لگی۔ وہ کسی انگریزی فلمی رسالے کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ لائبریرین نے اسے الماری میں سے رسالہ نکال کر دیا۔ وہ رسالہ ہاتھ میں لئے واپس مڑی تو اس نے مجھے بیٹھے دیکھا۔ میں بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے تو دیکھنا ہی تھا۔ اس کے سوا وہاں دیکھنے کی اور چیز ہی کونسی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک سی گئی۔ بلکہ میز کی طرف جاتے جاتے رک گئی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اس نے مجھے پہچان لیا ہو کیونکہ "ادب لطیف" اور "سویرا" رسالوں میں میرے تین چار افسانے چھپ کر مقبول ہوچکے تھے اور ادب لطیف میں میری ایک تصویر بھی چھپی تھی۔ وہ لڑکی رسالہ ہاتھ میں لئے میری طرف آئی۔ میں سنبھل کر

بیٹھ گیا۔ آخر وہی بات نکلی۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"کیا آپ اے حمید ہیں؟" پھر وہ میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی اور میرے افسانے "منزل منزل" کے متعلق باتیں پوچھنے لگی۔

"کیا آپ کو واقعی "منزل منزل" کی ہیروئن راحیلہ سے محبت تھی؟"

میں نے جھوٹ بولا۔

"نہیں اتنی محبت نہیں تھی۔ بس ساتھ ساتھ رہنے سے محبت ہو ہی جاتی ہے۔"

میں اگر یہ جھوٹ نہ بولتا تو پھر میرے لئے اسے یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی تھی کہ مجھے تم سے محبت ہے اور تم دنیا میں پہلی لڑکی ہو جس سے میں نے محبت کی ہے۔ کیا کروں' یہ جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔ اصل میں دیکھا جائے تو یہ محبت وغیرہ بھی جھوٹ موٹ کا کھیل ہوتا ہے۔ اس میں ایسا پردہ گرتا ہے کہ پھر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

اس لڑکی کو یہ سن کر بڑا صدمہ ہوا۔ میری طرف پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھنے لگی۔ بولی۔

"تو آپ نے یہ سب کچھ جھوٹ لکھا تھا؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کم از کم ایک ادیب کو جھوٹ نہیں لکھنا چاہیے تھا۔"

اس دوران میں نے اس کا اچھی طرح سے جائزہ لے لیا تھا۔ کچھ وقت کے لئے محبت کرنے کے واسطے وہ بڑی موزوں لڑکی تھی۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ دو چار ملاقاتوں کے بعد اس سے اظہار محبت کروں گا۔

"آپ کوہ مری میں کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

میں نے اپنی جگہ بتائی تو وہ بولی۔

"میں اپنی آنٹی کے ساتھ کیپٹل سینما کے پاس کالج کی انیکسی میں ٹھہری ہوں۔"

میں نے اسے یہ بالکل نہ بتایا کہ میں وہاں اسے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔

لڑکی بڑی انٹیلیکچوئل ٹائپ کی تھی۔ بس یہی ایک مصیبت تھی۔ ایسی لڑکیاں عام طور پر بڑی بور ہوتی ہیں۔ مگر یہ بات حوصلہ افزا تھی کہ وہ گفتگو بڑی دلفریب انداز میں کرتی تھی اور اس کا نچلا ہونٹ بڑا خوبصورت تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی یونانی سنگتراش نے یاقوت میں سے تراشا ہو۔ اس کا اصلی نام میں نہیں لکھوں گا۔ آپ شرمیلا سمجھ لیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"کوہ مری کا اصل لطف برفباری کے سیزن میں آتا ہے۔ جولائی، اگست میں تو یہاں میلہ لگا ہوتا ہے۔ اس موسم میں مری اپنا حسن چھپا لیتی ہے۔"

وہ لڑکی بھی مجھ سے اپنا بہت سا حسن چھپا رہی تھی لیکن میں نے اس کے حسن کو بے نقاب کرنے کا پختہ عزم کر رکھا تھا میں کیا کرتا۔ وہ عمر ہی ایسی تھی۔ وہ اردو افسانے پر باتیں کرنے لگی۔ معلوم ہوا کہ وہ راولپنڈی کے ایک کالج میں پڑھتی ہے اور اردو ادب اس کا پسندیدہ سبجیکٹ ہے۔ افسانہ نگاروں میں اشفاق احمد کا ذکر بھی آیا۔ یہاں میں نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارتے ہوئے اُسے بتایا کہ اشفاق احمد بھی میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس پر وہ خوشی کے مارے کرسی پر اچھل سی پڑی۔

"کیا واقعی؟ اشفاق صاحب بھی مری میں ہیں؟"

اشفاق کے لئے اس کا اس قدر اشتیاق دیکھ کر میں جل بھن گیا۔ مگر اب میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مجھے کہنا پڑا۔

"ہاں، وہ میرے ساتھ ہی کوہ مری آیا ہے۔ شاید آج یا کل صبح واپس لاہور چلا جائے۔"

اب میں اشفاق احمد کو ہر قیمت پر راستے سے ہٹانا چاہتا تھا مگر وہ لڑکی یعنی شرمیلا تو اشفاق کی گرویدہ تھی۔ کہنے لگی۔

"میں آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گی پلیز مجھے ایک بار اشفاق صاحب سے ملا دیجئے۔ اشفاق احمد میرے پسندیدہ رائٹر ہیں۔ بس

میں انہیں ایک بار صرف ایک بار اپنے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میں نے سینے پر پتھر رکھ کر کہا۔

"یہ کونسی مشکل بات ہے۔ آپ آج شام یہ ساتھ والے سمز ریستوران میں آجائیں۔ میں اشفاق کو لے کر آجاؤں گا۔"

لڑکی بے تاب ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ابھی ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی؟"

میں دل میں اشفاق کو گالیاں دینے لگا۔ لڑکی سے کہا۔

"ابھی تو شاید وہ سو رہا ہوگا۔ چار بجے میں اسے لے آؤں گا۔"

"ہائے چار بجے تک میں کیسے انتظار کروں گی۔"

اب مجھے اس لڑکی پر بھی غصہ آنے لگا۔ میں نے دل میں اسے بھی گالی دی اور اوپر سے بڑی شائستگی سے کہا۔

"چار بجنے میں تین چار گھنٹے ہی باقی ہیں۔"

اب اس لڑکی نے اشفاق کی ان کہانیوں کی باتیں شروع کر دیں جو "ادب لطیف" میں حال ہی میں چھپی تھیں۔ مجھے اور زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ اوپر سے میں مسکرا مسکرا کر ہوں ہاں کرتا جاتا تھا۔ پھر وہ چلی گئی۔ مگر جاتے جاتے مجھے بار بار یہی کہتی رہی۔

"پلیز! اشفاق صاحب کو ضرور لایئے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ واپس لاہور چلے جائیں اور میں ان سے ملنے کی حسرت ہی لے کر یہاں سے جاؤں۔"

میں نے دل میں کہا۔ اب دفع بھی ہو جاؤ۔ مگر اوپر سے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ اشفاق صاحب کو میں لے آؤں گا۔"

وہ چلی گئی اور میں نے دریا میں مچھلی پکڑنے کے لئے جو کنڈی ڈالی تھی اسے باہر نکال لیا۔ یہ مچھلی اشفاق کے کانٹے میں پہلے ہی سے پھنسی ہوئی تھی اور میرا یہ اصول رہا ہے کہ میں دوسرے کا مارا ہوا شکار کبھی نہیں کھاتا۔

اشفاق کوارٹر میں ہی تھا۔ میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"اوئے ایک فضول سی بدشکل سی کوڑ مغز لڑکی تم سے ملنا چاہتی ہے۔ چار بجے میرے ساتھ سمرز ریستوران میں چلنا۔"

میں نے یہ بتایا ہی نہیں کہ یہ وہی ٹیرس والی لڑکی ہے۔ اشفاق حسب معمول لڑکی کے ذکر پر شرما گیا۔ میں نے اسے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"لڑکیوں کی طرح شرمانا تھا تو افسانے کیوں لکھے تھے؟ کس نے کہا تھا افسانے لکھو؟ لڑکی تمہاری بڑی زبردست مداح ہے مگر بڑی بور انٹلیکچول قسم کی ہے بس جس طرح تم بور ہو بالکل ویسی ہی ہے۔"

اشفاق شرماتا رہا۔ مسکراتا رہا اور بار بار کان کھجاتا رہا۔ میں غصے میں فرش پر پڑی ہوئی چیزوں کو ٹھڈ مارتا اپنے بستر پر جا کر لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ اشفاق نے کہا۔

"تم سونے لگے ہو۔ سمرز نہیں جانا چار بجے؟"

میں نے لحاف میں سے منہ نکال لیا اور اشفاق کی طرف دیکھا۔

"واہ واہ! ابھی سے عشق کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ میں سوتا ہوں۔ چار بجے اٹھا دینا۔"

چار بجے میں اشفاق کو لے کر سمرز ریستوران پہنچ گیا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ ڈاک خانے کے چوک سے لے کر ایجنسی تک مال روڈ بالکل خالی تھی۔ ایک دھند سی اتر رہی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ برفباری ہوگی۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ ہوا ابھی بڑی برفیلی چل رہی تھی۔ میں نے اشفاق کے قریب ہو کر کہا۔

"یہ لڑکی تمہاری زبردست مداح ہے۔ بلکہ تم سے بے حد محبت کرتی ہے۔ مگر یاد رکھو وہ اپنی زبان سے کبھی محبت کا اظہار نہیں کرے گی۔ یہ کام تمہیں کرنا پڑے گا۔ کرو گے؟"

اشفاق نے مجھے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"تم خواہ مخواہ ہر بات پر رومانس کا کوٹ پھیرنا شروع کر دیتے ہو۔ کیا

محبت کے بغیر ہم کسی خاتون سے نہیں مل سکتے۔ وہ میری مداح ہے۔ تمہاری بھی مداح ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کافی پئیں گے۔ باتیں کریں گے۔ اچھا وقت گزاریں گے اور واپس آجائیں گے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ اس کے سامنے میں احمق بن کر محبت کے ڈائیلاگ بولنے شروع کر دوں۔ کبھی کبھی رومانس کی عینک اتار کر بھی لوگوں کو دیکھ لیا کرو۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم اگر اس موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تو نہ سہی۔ میں تو اس لئے کہہ رہا تھا کہ یہ رومانس تمہارے افسانے کو چار چاند لگا دے گا۔"

اشفاق احمد بولا۔

"میرے افسانے کو جو ایک دو چاند لگے ہوئے ہیں وہی کافی ہیں۔"

مال روڈ پر درمیان میں سے برف ہٹا دی گئی تھی۔ اب صرف سڑک کے کنارے برف کی ڈھیریاں لگی تھیں۔ ہم دونوں سڑک کے درمیان چل رہے تھے۔ کیپٹل سینما کی پتھریلی دیوار کے اوپر چڑھ کر درخت سرمئی بادلوں میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ یہ بادل برف لا رہے تھے۔ مال روڈ پر اندھیرا سا چھا گیا۔ اشفاق خاموشی سے چل رہا تھا۔ ہم سمرز ریستوران میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس وقت چار بج کر دس منٹ ہوا تھے۔ سمرز کا لمبا جہازی کمرہ تقریباً خالی خالی تھا۔ کونے میں ایک گاہک اوور کوٹ کے کالر چڑھائے کھڑکی کے قریب بیٹھا شیشوں میں سے سڑک پر چھائے ہوئے سرمئی بادلوں کا منظر دیکھ رہا تھا۔ یہ سرمئی بادل دھوئیں کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ درمیان میں بخارچی سلگ رہی تھی مگر سردی اس قدر زیادہ تھی کہ صرف بخارچی کے ارد گرد ہی گرمائش محسوس ہوتی تھی۔

میں نے کھڑکی کے دھندلے شیشے کو ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے اوپر

ٹیرس کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی دھند اور بادل چھا رہے تھے۔ مجھے انیکسی یا برآمدہ وغیرہ کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے بیرے کو کریم کافی کا آرڈر دیتے ہوئے اشفاق سے کہا۔

"میرا خیال ہے اس خراب موسم میں وہ لڑکی شاید گھر سے نہ نکلے۔"

اشفاق بولا۔

"ہو سکتا ہے نہ آئے۔ میں صرف اس کی خاطر نہیں آیا۔ میں تو اس سرد ویران بر فیلے موسم میں کافی پینے آیا ہوں۔"

"اسی لئے میں نے کافی کا آرڈر دے دیا ہے۔"

دل سے میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ لڑکی نہ ہی آئے۔ مجھے اب اس لڑکی سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں بھی کتنا خود غرض تھا۔ جب تک وہ لڑکی میری دوستی کی باتیں کرتی رہی میں اس کے ساتھ رہا۔ اس کا دم بھرتا رہا۔ جونہی اس نے کسی دوسرے لڑکے سے دلچسپی لینی شروع کی میں اسی کے خلاف ہو گیا۔ شاید یہ انسان کی بلکہ مرد کی فطرت بھی ہے۔ شاید نیچر بھی یہی چاہتی ہے۔ میں بار بار کھڑکی کے شیشے کو صاف کر کے نیچے ہال پر نگاہ ڈالتا کہ وہ لڑکی تو نہیں آ رہی۔ آخر وہ مجھے نظر آ گئی۔ اس نے گرم جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں دیئے اوپر ڈاک خانے کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

"لو بھائی! وہ آ رہی ہے۔ اچھا ہوا بیرا ابھی تک کافی نہیں لایا۔"

اشفاق نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ لڑکی سیمز کا زینہ چڑھ رہی تھی۔ میں اٹھ کر زینے کے پاس چلا گیا۔ لڑکی کا چہرہ سردی کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میرا خیال تھا موسم خراب ہو گیا ہے شاید آپ نہ آئیں۔"

وہ ہنس پڑی۔

"آپ رومانوی افسانہ نگار ہو کر اس موسم کو خراب کہہ رہے ہیں۔ یہ تو مری کا سب سے خوبصورت موسم ہے۔"

میں اسے لے کر اپنی میز کی طرف بڑھا۔ اس نے اشفاق احمد کے بارے میں پوچھا۔

"اشفاق صاحب آئے ہیں نا؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں' وہ بیٹھے ہیں۔"

اشفاق احمد تعظیم کے طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی نے بے باکی کے ساتھ اشفاق سے ہاتھ ملایا اور وہ اشفاق کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بیرا میرے قریب سے گزرا تو میں نے اسے اشارے سے کہا کہ تین کافی لائے۔ وہ اثبات میں مسکراتے ہوئے سر ہلا کر آگے نکل گیا۔

اشفاق احمد نے لڑکی سے باتیں شروع کر دیں کیونکہ اس کے دل میں لڑکی سے محبت وغیرہ کا کوئی خیال نہیں تھا اس لئے وہ پوری آزادی اور بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ اگر لڑکی اسے یہ کہہ دیتی کہ مجھے تم سے محبت ہے میں تم پر دل و جان سے عاشق ہوں تو پھر معاملہ الٹ ہو جاتا۔

لڑکی اشفاق احمد کے افسانوں کے بارے میں اس سے پوچھ رہی تھی کہ فلاں افسانے میں اس نے جو فلاں جملہ لکھا ہے اس سے کیا مراد تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس لڑکی کو اشفاق احمد کی کہانیوں کے جملے کے جملے یاد تھے۔ پھر لڑکی نے اشفاق احمد سے میرے بارے میں پوچھا کہ اس کا میرے افسانوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں اور ٹمپل کالج کی اردو کی کلاس میں بیٹھا ہوں وہ لڑکی مجھے بڑی خشک قسم کی دانشور لڑکی لگنے لگی تھی۔ بیرا کافی رکھ کر چلا گیا۔

اچانک مال روڈ پر سرمئی بادلوں میں سفید سفید برف کی پھنکڑیاں گرنے لگیں۔ میں نے اشفاق احمد سے کہا۔

"برف گرنے لگی ہے۔"

اشفاق احمد اور لڑکی دونوں نے باتیں کرتے کرتے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ باہر برف گر رہی تھی۔ میں نے کافی بنائی۔ کافی شاید اسی موسم کے لئے اسی دن کے لئے' اسی برفباری کے لئے قدرت نے بنائی تھی۔ سیاہ بادلوں کی وجہ سے اندھیرا چھا گیا تھا۔ سمر ریستوران کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ لڑکی نے کہا۔

"میرا خیال ہے کھڑکی کھول دیں۔ کہتے ہیں برفباری کے وقت جو ہوا چلتی ہے وہ کچھ نہیں کہتی۔"

مگر اشفاق نے کھڑکی نہ کھولنے دی۔

"بی بی! اندر گرمائش ہے۔ باہر سردی ہے۔ کھڑکی کھولو گی تو گرم سرد ہو جائیں گے۔"

وہ موسم واقعی کھڑکی کھول کر بیٹھنے کا تھا۔ مگر اشفاق احمد کو اندیشہ تھا کہ کہیں اس کو زکام وغیرہ نہ ہو جائے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو رومان اشفاق احمد کے قریب سے بھی ہو کر نہیں گزرا۔ میں کسی لڑکی سے رومان کی بات نہیں کر رہا۔ بلکہ نیچر کے رومان کی بات کر رہا ہوں۔ رومان اس کے مزاج کے خلاف ہے۔ چونکہ یہ اس کے مزاج کا حصہ نہیں ہے اس لئے میں بھی اس کے ساتھ نیچر کے رومان کی باتیں نہیں کرتا۔ نیچر کے رومان کی دنیا ہی اور ہے۔ یہ ملک ہی اور ہے۔ اس کی آب و ہوا ہی اور ہے۔ یہاں مجھے گوالمنڈی کا ایک پہلوان یاد آ گیا ہے۔ اس پہلوان کی گوالمنڈی میں دودھ کی دکان تھی۔ حسن طارق نے مجھے بتایا کہ یہ پہلوان بڑی مزے دار باتیں کرتا ہے۔ اس کی اپنی ڈکشن ہے۔ ذرا تم اس سے کوئی بات کر کے دیکھو۔ میں نے حسن طارق سے کہا۔ "کیا بات کروں؟"

حسن طارق نے کہا۔

"پہلوان کو موسیقی کا بڑا شوق ہے۔ تمہیں بھی موسیقی کا شوق ہے۔ چلو موسیقی کے بارے میں اس سے کوئی سوال کرو۔"

ہم دونوں پہلوان کی دکان پر گئے۔ پہلوان دودھ کی بہت بڑی کڑاہی میں کھانچہ چلا رہا تھا۔ حسن طارق نے پہلوان سے کہا۔

"پہلوان جی! یہ میرے دوست ہیں۔ یہ آپ سے موسیقی کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔"

پہلوان کا چہرہ بڑا بھولا بھالا اور معصوم تھا۔ کہنے لگے۔

"پوچھو جی! ضرور پوچھو۔"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"پہلوان جی! یہ بتائیں کہ راگ مالکونس اور راگ بھیروں میں کیا فرق ہے؟۔"

پہلوان نے ہنس کر کہا۔

"یہ کیا بات کروی ہے آپ نے باؤ جی! کہاں راگ مالکونس' کہاں راگ بھیروں۔ وہ ملک ہی اور ہے۔ آب و ہوا ہی اور ہے۔۔۔"

نیچر کے رومانس کے حوالے سے مجھ میں اور اشفاق احمد میں راگ مالکونس اور راگ بھیروں کا فرق ہے۔ وہ ملک ہی اور ہے اس کی آب و ہوا ہی اور ہے۔ مگر ہمارا ایک سُر ضرور ملا ہوا ہے اور وہ ہے محبت کا سُر۔ اسی سُر نے ہمیں ایک دوسرے سے ملا رکھا ہے۔ چونکہ سُر ملے ہوئے ہیں اس لئے ہماری محبت بے غرض ہے۔ بغیر لالچ کے ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے کچھ نہ لینا ہے نہ دینا ہے۔ چاہے دو سال بعد ملیں۔ دونوں جب ملتے ہیں تو پیار محبت کی ہوا چلنے لگتی ہے۔ پیار محبت کی فضا قائم ہو جاتی ہے اور اسی پیار محبت کی فضا میں ہم دوبارا کئی سال بعد ملنے کے لئے جدا ہو جاتے ہیں۔ برف زیادہ گرنے لگی تو وہ لڑکی جس کا فرضی نام میں نے شرمیلا بتایا تھا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب میں جاتی ہوں۔ آنٹی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ اچھا اشفاق صاحب' پھر ملاقات ہوگی۔ آپ کل دونوں حضرات شام کی چائے میرے ہاں کیوں نہیں پیتے؟ میری آنٹی بھی بڑی ادب دوست ہیں۔

"وہ آپ دونوں سے مل کر بڑی خوش ہوں گی۔"

اشفاق کچھ ہچکچا رہا تھا۔ میں نے فوراً کہہ دیا۔

"ضرور آئیں گے۔ کتنے بجے آجائیں؟"

"یہی چار بجے آجایئے گا۔"

اشفاق بولا۔

"موسم زیادہ خراب ہوا تو شاید ہم نہ آسکیں۔"

میں نے کہا۔

"کوئی خراب نہیں ہوتا موسم۔ خراب بھی ہوا تو ہم اسے ٹھیک کرلیں گے۔"

وہ چلی گئی۔ ہم گرتی برف میں اسے ڈاک خانے کی طرف چڑھائی پر سنبھل سنبھل کر چلتے دیکھتے رہے۔ اشفاق کہنے لگا۔

"بڑی ذہین خاتون ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"کل شام اس کے ہاں چلو گے یا نہیں؟"

اشفاق شرما سا گیا۔

"یار! تم چلے جانا۔ میں کہاں جاؤں گا۔"

میرا خیال تھا کہ وہ دل سے نہیں کہہ رہا۔ مگر وہ دل سے کہہ رہا تھا۔ دوسرے دن مجھے اکیلے ہی شرمیلا کے ہاں چائے پر جانا پڑا۔ میں نے بڑا اصرار کیا مگر اشفاق نہ مانا۔ یہی کہتا رہا۔

"یار! مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ریڈیو کے لوگ خواہ مخواہ سکینڈل بنا دیں گے۔"

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اشفاق احمد کو ہمیشہ اپنی عزت نفس کا بڑا خیال رہتا ہے اور یہی وہ بات ہے جس نے اسے اس کی ادبی حیثیت کے علاوہ' معاشرے میں ایک باعزت مقام عطا کیا ہے۔ اشفاق احمد کی دوسری خوبیوں کے ساتھ ساتھ

میں اس کی اس خوبی پر بھی رشک کرتا ہوں۔ عزت نفس کا جو شخص بھی احترام کرے میں اس پر رشک کرتا ہوں اور اشفاق میں یہ وصف بدرجہ اتم موجود ہے۔ میرے دل میں اشفاق کے لئے جو محبت ہے اس میں ان کے اس وصف کا بھی بڑا دخل ہے۔

میں اکیلا ہی شرمیلا کے ہاں چائے پر چلا گیا۔

اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"اشفاق صاحب نہیں آئے کیا؟"

میں نے کہا۔

"ابھی آجائیں گے۔ انھیں ریڈیو کے لئے ایک ضروری تقریر لکھنی پڑ گئی ہے۔"

شرمیلا کے چہرے پر مایوسی کا غبار سا چھا گیا۔ اس نے اپنی آنٹی سے میرا تعارف کرایا۔ شرمیلا نے چائے کا بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ اہتمام زیادہ تر اشفاق احمد کی خاطر کیا گیا ہے۔ میں وہاں کچھ شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا۔ شرمیلا کی آنٹی کو بھی اشفاق سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔ کہنے لگی۔

"اشفاق صاحب تقریر لکھنے کے بعد آجاتے۔ ہم ان سے بڑی باتیں کرنا چاہتے تھے۔"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"شاید آجائیں' مگر میرا خیال ہے کہ انھیں وہیں رات کے نو بج جائیں گے۔"

اس شام برف بھی نہیں گر رہی تھی۔ کل کی گری ہوئی برف راستوں پر جمی ہوئی تھی۔ سردی بہت تھی۔ شرمیلا نے کمرے کے آتشدان میں آگ جلا رکھی تھی۔ کمرے کی فضا نیم گرم اور پرسکون تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا تو شرمیلا کی آنٹی نے برا سا منہ بنایا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے سگریٹ کا دھواں

پسند نہیں ہے۔ میں نے اس کی بالکل پروا نہ کی اور جان بوجھ کر سگریٹ کا کش لگا کر آدھا دھواں اس کی طرف پھینک دیا۔ آنٹی اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ شرمیلا موسم کی باتیں کرنے لگی۔ پھر اردو افسانے پر گفتگو شروع ہوئی۔ میں مسلسل کوشش کر رہا تھا کہ میرے سگریٹ کا دھواں کچن کی طرف جائے جہاں شرمیلا کی آنٹی خدا جانے کیا کر رہی تھی۔ میں اس موٹی آنٹی کو زیادہ سے زیادہ سگریٹ کی دھونی دینا چاہتا تھا۔ خدا جانے میں کیوں چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد آنٹی کچن میں سے نکل کر ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت میں سگریٹ نہیں پی رہا تھا۔ میں آنٹی کو دھونی دینے کے لئے سگریٹ سلگانے لگا تو شرمیلا نے کہا۔

"آپ اتنے سگریٹ نہ پیا کریں۔"

میں نے شرمیلا کا خیال کر کے سگریٹ واپس پیکٹ میں رکھ دیا۔

"میں زیادہ نہیں پیتا۔ بس کبھی کبھی خواہ مخواہ سگریٹ سلگانے کو دل کرتا ہے۔"

اس وقت میں شرمیلا کی موٹی آنٹی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ کنکھیوں سے دیکھنا بھی عجیب ہے۔ میرا خیال ہے اس کا مطلب کان اور آنکھوں کے درمیان میں سے کسی کو دیکھنا ہوتا ہے۔

○

شرمیلا کے ہاں سے میں کافی دیر بعد واپس آیا۔

رات کا اندھیرا مری میں پھیل چکا تھا۔ مال روڈ کی بتیاں سرد کہرے میں جھلملا رہی تھیں۔ ان کی روشنی کھمبوں تک ہی محدود تھی۔ ساری سڑک ویران تھی۔ سیمز بھی بند ہو چکا تھا۔ میں برف کے درمیان بنے ہوئے راستے پر آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتا اوپر ریڈیو سٹیشن کی طرف سے دیئے ہوئے کوارٹروں میں آ گیا۔ اشفاق احمد جاگ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"بڑی دیر لگا دی۔ اتنی دیر وہاں کیا کرتے رہے؟"

میں نے اوور کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

"کیا کرتا تھا۔ شرمیلا تمہاری تعریفیں کرتی رہی۔ میں سنتا رہا۔"

"میری طرف سے معذرت کر دی تھی نا؟"

"کر دی تھی۔" میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ویسے تم چلے جاتے تو ان لوگوں کو بڑی خوشی ہوتی۔ انہوں نے چائے کا بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔"

"بس یار۔" اتنا کہہ کر اشفاق چپ ہو گیا۔

اس کے بعد ہم ایک مہینہ کوہ مری میں رہے۔ اس دوران دو تین بار شرمیلا سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ایک بار مال روڈ پر آتے جاتے۔ دوسری بار میونسپل لائبریری میں اور تیسری بار سیمز ریستوران میں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ تینوں بار اشفاق میرے ساتھ نہیں تھا اور شرمیلا اشفاق احمد کو یاد کرتی رہی۔

ہم لوگ کوہ مری کو الوداع کہہ کر واپس لاہور آ گئے۔

لاہور میں ہم دونوں کی نئی بھرپور ادبی زندگی کا دور شروع ہو گیا۔ اس کے بعد کوہ مری والی شرمیلا سے ملاقات نہ ہو سکی۔ شروع شروع میں ہم باتوں باتوں میں اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ پھر وہ ہمارے ذہنوں سے بھی اتر گئی۔

یہ سات برس پہلے کی بات ہے کہ میں ٹیلی ویژن سٹیشن سے نکل رہا تھا کہ ایک ٹیکسی گیٹ کے پاس آ کر رکی۔ اس میں ایک فیملی بیٹھی ہوئی تھی۔ بچے تھے' دو عورتیں تھیں۔ ادھیڑ عمر کی ایک موٹی عورت باہر نکل کر ٹیکسی والے کو پرس میں سے پیسے نکال کر دینے لگی۔ دوسری عورت جوان تھی وہ بچوں کو باہر نکالنے لگی۔ ادھیڑ عمر کی موٹی عورت کو دیکھتے ہی مجھے خیال گزرا کہ اس عورت کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ اس وقت وہ عورت پلٹ کر ٹی وی کے گیٹ کی طرف بڑھی۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں۔ وہ بھی ٹھٹھک گئی۔ اب ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی 1948ء کے کوہ مری والی انٹیلیکچویل لڑکی شرمیلا تھا۔ اس کی انٹلیکٹ بوڑھی اور موٹی ہو گئی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر شرمسار ہو رہے تھے کہ ہم کیوں مل گئے۔ ہمیں نہیں ملنا چاہیے تھا۔ ملنے کی عمر تو وہی تھی جب ہم کوہ مری میں ملے تھے۔ جب اس وقت مل کر ہم وقت کے ہاتھ سے پھسل کر گر پڑے تو اب ملنے کی کیا ضرورت تھی۔ عمر نے اس کے چہرے پر سے ذہانت اور رومانوی افسردگی کی تمام روشنیاں گل کر دی تھیں۔ اس کے جسم کی وہ تمام دبلی پتلی پگ ڈنڈیاں جو کوہ مری کے برف پوش درختوں کے درمیان سے ہو کر گزرتی تھیں' بڑھاپے اور موٹاپے کے بادلوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو چکی تھیں۔ اس کے سر کے بالوں پر بھی میرے بالوں کی طرح وقت کی برف گر رہی تھی۔ کوہ مری میں جب ہمارے بالوں پر برف گرتی تھی تو ہم اسے جھٹک کر جھاڑ دیا کرتے تھے۔ مگر اب جو برف گر رہی تھی وہ ہمارے بالوں کو سفید کرنے کے لئے گر رہی تھی۔

اس نے دوسری عورت سے میرا تعارف کرایا۔ یہ میری بیٹی ہے۔ یہ

اس کے بچے ہیں۔ اس عورت نے ایک سرسری سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر بچوں کو ٹیکسی میں سے باہر کھینچنے لگی۔ میں نے شرمیلا سے اشفاق کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا۔

"اشفاق احمد سے ملاقات نہیں ہوئی؟" اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ جیسے وقت کے کوڑے کرکٹ میں سے سوئی تلاش کر رہی ہو۔"

"ہاں! اشفاق صاحب سے نہیں۔ ان سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ ہم لوگ دبئی میں ہوتے ہیں۔ وہاں میرے میاں کا اپنا کاروبار ہے۔"

ایک لڑکا گیٹ کی طرف دوڑا تو شرمیلا نے اپنی بیٹی کو چیخ کر کہا۔

"نی صغراں اسے پکڑ۔"

میں نے شرمیلا سے اس ملاقات کا ذکر اشفاق احمد سے کیا تو وہ بڑا حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

"کون شرمیلا؟"

جب میں نے کوہ مری کے زمانے کا ذکر کیا تو وہ ہنس پڑا۔

"اچھا؟ یار وہ کیسی تھی؟"

میں نے کہا۔

"بس ویسی ہی تھی جیسے ہم ہو گئے ہیں۔"

"ہاں یار! بڑا وقت گزر گیا ہے اس بات کو۔"

وقت بہت گزر گیا تھا۔ وقت اب بھی گزر رہا ہے۔ پہلے اس کے گزرنے کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ اب وہ جسم کے ہر حصے پر سے گزرتا نظر آتا ہے۔ کبھی وہ نقش و نگار بناتا تھا۔ اب وہ نقش و نگار بگاڑ رہا ہے۔ اس نادان بچے کی طرح جو اپنی ہی بنائی ہوئی تصویر پر لکیریں مار رہا ہو۔ اگر کسی شے پر وقت کا اثر نہیں ہوتا تو وہ محبت ہے۔ محبت کا جذبہ ہے۔ محبت کے ساتھ چلتے

چلتے وقت خود بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اگر محبت سچی ہے تو نہ وقت کا ہاتھ اس کے دامن تک پہنچ سکتا ہے۔ نہ موت اسے خاک میں ملا سکتی ہے۔ کتنی خوبصورت، کتنی لازوال ہے محبت ——— ماں باپ سے محبت، اولاد سے محبت، محبوبہ سے محبت ——— دوست سے محبت ——— جنگلوں، بارش، پھولوں، سمندروں، دریاؤں، نیلے آسمان پر اڑتے پرندوں، درختوں پر خاموشی سے گری پاکیزہ برف سے محبت، آتشدان کے پاس بیٹھ کر سیلون کی چائے پینے کے خیال سے محبت، چٹانوں سے ٹکراتی سمندر کی طوفانی موجوں سے محبت، کھلے سمندروں پر برستی بارشوں سے محبت، بارش میں بھیگتے جنگل میں کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر گیلے سگریٹ کو سلگانے کے تصور سے محبت ——— اگر محبت ہے تو سب سچ ہے۔ اگر محبت نہیں ہے تو سب جھوٹ ہے۔"

یہ محبت ہے جو مجھے آج بھی اپنے دوست اشفاق احمد کا وہی چمکتا ہوا خوش نما چہرہ دکھاتی ہے جو میں نے پہلی بار 1947ء میں دیکھا تھا۔ زندگی کے سٹیج پر وقت بڑے پردے گراتا ہے۔ مگر محبت میں کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ کوئی پردہ نہیں گرتا۔ سٹیج پر وہی سیٹ لگا ہے۔ وہی پہلا ایکٹ کھیلا جا رہا ہے۔ میں پاک ٹی ہاؤس میں کاؤنٹر کے ساتھ والی میز پر بیٹھا ہوں اور اشفاق احمد اپنے چمکیلے بالوں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے۔ وہ میرے پاس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر چائے اور اعلیٰ ترین سگریٹ کی خوشبو میں باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ آج بھی اسی طرح میرے سامنے بیٹھا ہے۔ چائے اور سگریٹ کی خوشبو نے ہمیں اپنی آغوش میں لے رکھا ہے اور ہم باتیں کر رہے ہیں۔ باتیں بھول گئی ہیں۔ خوشبوئیں ویسی کی ویسی ہیں۔ چہرے ویسے کے ویسے ہیں۔ وہی چائے ہے۔ وہی خوشبوئیں ہیں۔ وہی گلاب ہیں۔ وہی موتیے کے پھول ہیں۔ جوں جوں وقت بوڑھا ہو رہا ہے۔ خوشبوئیں جوان ہوتی جا رہی ہیں۔ میں اشفاق احمد کو اسی طرح دیکھتا ہوں۔ مجھے وہ ویسے ہی نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اب ویسا نہیں رہا۔ اس نے ان خوشبوؤں کا ان پریوں کا

ہاتھ چھوڑ دیا ہے جو آدمی پر وقت کا اثر نہیں ہونے دیتیں۔ اتنی مدت گزر جانے کے بعد، اتنا سفر طے کر لینے کے بعد، صحراؤں، بیابانوں، وادیوں سے گزر کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد نیچے نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اشفاق احمد کے ساتھ ایک بھی خوشبو ایک بھی پری دکھائی نہیں دیتی۔ اس کا ان چیزوں کے ساتھ کبھی بھی کوئی ربط نہیں رہا۔ یہ چیزیں اس کے مزاج کے بالکل خلاف ہیں۔ یہ رات کی رانی کا ہی حوصلہ ہے کہ وہ سارا دن خوشبو کے سیلاب کو اپنے سینے میں دبائے رکھتی ہے۔ کیا مجال ہے کہ رات ہونے سے پہلے خوشبو کی ہلکی سی مہک بھی اس کے سینے سے باہر نکل آئے۔ یہ صبر، یہ تحمل، یہ برداشت رات کی رانی کو نیچر نے سکھائی ہے جس کی خوشبوئیں ننھی ننھی پریاں بن کر اس کے آنگن میں نازل ہوتی ہیں۔

برسات کا موسم تھا۔ میں اشفاق احمد کے پاس اس کے اردو مرکز والے دفتر میں بیٹھا تھا۔ مشرق کی جانب سے کالی گھٹا اٹھی اور دن کے وقت اندھیرا سا چھا گیا۔ کمرے میں اے سی لگا تھا۔ شیشے کی ریلنگ والی دیوار بند تھی۔ شیشے میں سے باہر درختوں کی شاخیں ہوا میں جھومتی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

"چلو برآمدے میں چلتے ہیں۔"

وہ اے سی والا کمرہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مگر میرے ساتھ باہر برآمدے میں آ گیا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بارش شروع ہو گئی۔ پہلے ہلکی ہلکی، پھر تیز ہو گئی۔ بارش کی بوچھاڑیں برآمدے میں ہمارے اوپر آنے لگیں۔ ان ہواؤں میں بارش کی خوشبوئیں تھیں۔ سارے درختوں سارے پودوں سارے سرسبز گھاس کی خوشبوئیں تھیں۔ نہ جانے کیسے اور کیوں مجھے بارش کی گیلی ہوا میں سمندر کی خوشبو کی لہری محسوس ہوئی اور مجھے لڑکپن میں سنا ہوا ایک گیت یاد آ گیا۔

گنگا کا نرمل پانی

میرا جیون ایک کہانی

ان دنوں مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ گنگا کیا ہے۔ نرمل پانی کیا ہوتا ہے۔ جیون کیا ہے اور کہانی کیا ہوتی ہے۔ بس سامنے ایک سمندر تھا۔ پیچھے ناریل اور کیلے کے درخت تھے۔ رنگون کے بارش میں بھیگتے بازار تھے۔ گیلی سڑک پر چمکتی دکانوں کی روشنیاں تھیں اور فضا میں پھیلی ہوئی چائے' کافی' سگار اور سمندر کی خوشبوئیں تھیں۔ بارش کی بوچھاڑیں زیادہ تیز ہو گئیں تو اشفاق نے کہا۔

"چلو اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

لاہور کے فاقہ مست شاعروں ادیبوں کے ساتھ اشفاق احمد کا باقاعدہ اٹھنا بیٹھنا کبھی بھی نہیں تھا۔ ایسا کوئی شاعر ادیب راستے میں مل جاتا تو اشفاق اس کے ساتھ انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتا اور بعد میں مجھے کہتا کہ یار ان لوگوں کی زندگی پر مجھے رشک آتا ہے۔ اپنے حال میں مست رہتے ہیں لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اشفاق احمد کو اس قسم کے شاعر ادیبوں پر کبھی رشک نہیں آتا۔ فاقہ مست اور سفید پوش محنت کش شاعروں ادیبوں سے اشفاق احمد پاک ٹی ہاؤس کے زمانے میں ہی الگ ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں بھی وہ ان لوگوں کو صرف ٹی ہاؤس میں ملتا۔ اس نے شروع ہی سے اپنے لئے جو راستہ چنا تھا۔ وہ کچی بستیوں سے ہوتا ہوا قصر سلطانی کی طرف جاتا تھا۔ وہ قصر سلطانی پر تو اپنا نشیمن نہ بنا سکا مگر وہاں سے واپس بھی نہ آیا۔ وہ افسر ٹائپ کے سرکاری ادیبوں میں بیٹھ کر بڑا خوش ہوتا ہے۔ اس قسم کے ادیبوں اور شاعروں میں بیٹھ کر جب میں اسے سیاست اور سیاسی جوڑ توڑ کے بارے میں بڑی گرمجوشی سے باتیں کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی افسانہ نگار ہے جس نے "مہمان بہار" اور "گڈریا" جیسے افسانے لکھے تھے۔ اس وقت میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر درختوں کے پاس لے جاؤں۔ اگر باہر درخت نہ ہوں تو نہ سہی کم از کم کھلا آسمان تو ہوگا۔

آسمان پر پرواز کرتا ایک آدھ پرندہ تو ہوگا۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب ہم دونوں اپنے ایک دوست کی گاڑی میں بیٹھ کر شیخوپورے والی نہر پر گئے تھے اور اشفاق احمد نے شلوار قمیض سمیت نہر میں چھلانگ لگا دی تھی۔ یہ کام میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت مجھے وہ بڑا اچھا لگا تھا۔ نہر میں تیرتے ہوئے اس کی شلوار مشک کی طرح پھول گئی تھی۔ مجھے بڑی ہنسی آئی تھی۔

اشفاق احمد خاوند کیسا ہے؟ اس کے متعلق اس کی بیگم بانو قدسیہ ہی بہتر بتا سکتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اچھا خاوند ہوگا۔ اس کی ایک اور بات مجھے بہت پسند ہے کہ وہ اپنے گھریلو معاملات اپنے تک ہی محدود رکھتا ہے۔ مجھ سے کبھی اپنے بچوں کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ یقین کریں مجھے اس کے بیٹوں کے نام تک معلوم نہیں ہیں اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ کون کہاں ملازم ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں بھی اپنے دوستوں کے گھریلو معاملات میں کبھی دخل اندازی نہیں کرتا۔ دوستوں کی اولاد سے مجھے پیار ضرور ہوتا ہے مگر میں نے کبھی کرید کرید کر نہیں پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو۔ یہ کیوں نہیں کرتے۔ وہ کیوں نہیں کر لیتے۔ کیونکہ میں اتنا جانتا ہوں کہ جس کسی نے جو کرنا ہوتا ہے وہ وہی کرتا ہے بلکہ کر کے رہتا ہے۔ جن لوگوں نے دوسروں کی نصیحتوں اور مشوروں پر عمل کیا میں نے انہیں آخر میں پچھتاتے ہی دیکھا ہے۔

اشفاق احمد کا ہینڈ رائٹنگ بہت اچھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ ریڈیو وغیرہ کے سکرپٹ عام طور پر کاغذ کی سلپیں کاٹ کر ان پر لکھتا ہے اور کالی روشنائی والا انڈی پین استعمال کرتا ہے۔ کاغذ پر لکھے ہوئے اس کے الفاظ بڑے سیدھے 'اوپر کو اٹھتے ہوئے اور جمے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کا تجزیہ تو کوئی ہینڈ رائٹنگ کا ماہر ہی کر سکتا ہے۔ مجھے اس کی لکھائی بڑی اچھی لگتی ہے۔ جب بھی اس کا کوئی خط یا کسی رقعے پر لکھا ہوا کوئی پیغام مجھے ملتا ہے تو میں اس کی لکھائی دیکھ کر بڑا خوش ہوتا ہوں۔ اردو زبان کے قواعد پر اسے دق

تیور حاصل ہے اور بڑے برمحل الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اپنا مفہوم ادا کرنے کے واسطے وہ لفظ ڈھونڈ کر لاتا ہے۔ مجھے اس سے اختلاف بھی ہے اور اختلاف یہ ہے کہ وہ دلی لکھنؤ والوں کی زبان لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہرگز نہیں کہ وہ دلی لکھنؤ کی زبان کے محاورے استعمال کرتا ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ وہ بعض چیزوں کے نام، جو پنجابی میں عام ملتے ہیں، دلی لکھنؤ میں بولے جانے والے نام لکھتا ہے۔ اکثر اوقات اسی کے جملوں کی بناوٹ بھی اہل زبان کی نقل میں ہوتی ہے۔ میں اسے ان نیچرل بات سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ہم پنجاب میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہمیں وہی اردو لکھنی چاہیے جو ہم پر پنجابی زبان کے سانچے میں ڈھل کر وارد ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی زبان کے بارے میں میں کچھ نہیں کہتا۔ دلی کی زبان کے بارے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ دلی والوں کی اردو لکھنے کے لئے دلی شہر میں کم از کم سات سو برس تک قیام کرنا ضروری ہے۔

اشفاق احمد سے اب کسی تقریب پر ہی ملاقات ہوتی ہے اور اس میں شرط یہ ہے کہ تقریب بھی کوئی دوسرا کرے۔ میں خود اپنے کام میں مصروف ہوتا ہوں۔ اس کے باوجود میں دو چار مہینوں میں اس سے ملاقات کرنے کا کوئی نہ کوئی وقت نکال لیتا ہوں اور کسی دوست کی گاڑی میں میں اس سے ملنے چلا جاتا ہوں۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑا خوش ہوتا ہے۔ ہم ڈرائینگ روم کھلوا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ چائے آجاتی ہے۔ میں بڑے اہتمام سے خود چائے بناتا ہوں۔ شروع شروع میں اس کے ہاں چائے اچھی نہیں ہوتی تھی۔ مگر اب اس نے بڑی عمدہ چائے منگوا رکھی ہے۔ ہم چائے پیتے ہوئے دنیا جہان کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اپنے خاص انداز میں بڑی مزیدار باتیں سناتا ہے۔ یہ باتیں نہ علمی ہوتی ہیں نہ ادبی ہوتی ہیں۔ نہ سیاسی ہوتی ہیں نہ معاشی اور نفسیاتی ہوتی ہیں۔ بس کچھ پرانے دنوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کچھ نئے زمانے کی باتیں کرتے ہیں۔

اسی طرح ایک بار میں اشفاق کے ڈرائینگ روم میں بیٹھا تھا۔ ہم

چائے بھی پی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے کہ ہم نے سوچا کیوں نہ ایک دن باہر نکل کر اپنی پرانی یادگاروں کی سیر کی جائے۔ اشفاق احمد نے کہا۔

"اگلے ہفتے کوئی دن رکھ لو۔"

ہم نے ایک دن طے کرلیا۔ اس روز موسم بڑا خوشگوار تھا۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ دھوپ میں وہ شدت نہیں رہی تھی۔ اشفاق احمد میرے گھر آگیا۔ میں پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اشفاق نے پوچھا۔

"کیا خیال ہے پہلے کس طرف چلا جائے۔؟"

میں نے کہا۔

"سمن آباد میں ہیں تو پہلے کیوں نہ تمہارا سمن آباد والا مکان دیکھا جائے۔ اگرچہ اب اس کی جگہ ایک دو منزلہ کوٹھی بن چکی ہے مگر وہ جگہ تو وہی ہے۔"

"ہاں یار! پہلے وہیں چلتے ہیں۔"

اشفاق احمد کا سمن آباد والا مکان میرے مکان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے گاڑی سکول کی دیوار والی سڑک پر ڈال دی۔ سکول سے آگے بائیں جانب سمن آباد کی مسجد خضرا والی گراؤنڈ آگئی۔ اشفاق بڑے غور سے دائیں جانب کے ٹاہلی کے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہیں کہیں ہمارا گھر تھا۔"

میں نے کہا۔ "گاڑی اسی طرف کھڑی کرلو۔"

اس نے گاڑی بائیں طرف درختوں کے نیچے کھڑی کر دی۔ میں نے سامنے والی دو منزلہ کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہاں ہوتا تھا تمہارا مکان۔"

اشفاق احمد بڑی دلچسپی سے کھڑکی کا شیشہ اتار کر سامنے والی دو منزلہ کوٹھی کو دیکھنے لگا۔

"یہ جگہ کتنی بدل گئی ہے۔"

پھر اس نے گراؤنڈ کی طرف نگاہ ڈالی اور کہا۔

"یہاں کھجور کے تین درخت ساتھ ساتھ اُگے ہوئے تھے۔"

"ہاں جنہیں میں تھری سسٹرز کہا کرتا تھا۔"

اب ان درختوں کا نام و نشان بھی باقی نہیں تھا۔ اس زمانے میں گراؤنڈ میں خاک اڑا کرتی تھی۔ ساری گراؤنڈ میں کھجور کے صرف تین درخت تھے جو ساتھ ساتھ اُگے ہوئے تھے۔ باقی ساری گراؤنڈ کلر زدہ تھی۔ اب وہاں سرسبز گھاس تھی۔ پھولدار پودے لہرا رہے تھے۔ سنبل اور پاپولر کے درختوں کے جھنڈ سایہ کئے ہوئے تھے۔

ہم گاڑی سے نکل آئے اور سڑک کے کنارے وہاں آ کر کھڑے ہو گئے، جہاں سیڑھیاں نیچے باغ میں اترتی تھیں۔ اس نے کہا۔

"یہاں ایک آدمی بیٹھا سائیکل مرمت کرنے کا کام کرتا تھا۔ اس نے سائیکل کے ٹائر درخت پر لٹکائے ہوتے تھے۔"

میں نے کہا۔

"مدت ہوئی وہ یہاں سے غائب ہو چکا ہے۔ کیونکہ تمہارے یہاں سے جانے کے بعد میں سمن آباد میں آ گیا تھا۔"

ہم گراؤنڈ والے باغ میں تھوڑی دیر تک روشوں پر پھرتے رہے۔ سنبل کے درخت بڑے گھنے تھے۔ میں نے کہا۔

"یہ ابھی بچے ہیں۔ میرے سامنے چھوٹے چھوٹے تھے۔ یہ درخت کچھ نہیں تو پانچ چھ سو سال تک جاتا ہے۔"

میں نے سنبل کے درخت کے تنے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"یہ میرا یار ہے۔ میں صبح سیر کرنے یہاں آتا ہوں تو یہ میرے انتظار میں جاگ رہا ہوتا ہے۔ درخت کبھی نہیں سوتے۔ اگر سوتے بھی ہیں تو سوائے درختوں کے اور کسی کو پتہ نہیں چلتا۔"

کیاریوں میں گلاب کے رنگ برنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ ساتھ والی

گراؤنڈ میں لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اشفاق نے گہرا سانس بھرا اور بولا۔

"وقت کتنی تیزی سے گزر گیا ہے۔"

ہم گاڑی میں بیٹھ کر سمن آباد سے باہر نکل آئے۔ اشفاق نے پوچھا۔

"اب کس یادگار کی طرف چلیں؟"

میں نے کہا۔

"یہاں سے گاڑی شملہ پہاڑی کی طرف ڈال دو۔ پرانے ریڈیو سٹیشن والی جگہ کو چل کر دیکھتے ہیں۔"

"اوئے کم بخت! کیا یاد کرا دیا۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔ مگر یار! وہاں تو اب کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"جو بھی کچھ ہوگا چل کر دیکھتے ہیں۔"

ہماری گاڑی جب گورنمنٹ ہاؤس کے پیچھے سے ہو کر شملہ پہاڑی سے مال روڈ کی طرف جاتی سڑک پر آئی تو اشفاق نے کہا۔

"یہ سڑک تو پہچانی نہیں جاتی۔ تمہیں یاد ہے یہاں دونوں جانب پکی اینٹوں کے چھوٹے فٹ پاتھ ہوا کرتے تھے جن کے اوپر سرخ پھولوں والے درخت سایہ کئے ہوئے تھے۔"

میں نے کہا۔

"مجھے سب یاد ہے۔ ہم نے وہ درخت قتل کر دیئے ہیں اور اب خود قتل ہو رہے ہیں۔"

ہم پرانے ریڈیو سٹیشن والی سڑک پر آ کر ایک کوٹھی کے سامنے رک گئے۔ میں نے کہا۔

"یہاں کبھی ریڈیو سٹیشن ہوا کرتا تھا۔"

ہم دونوں اس وقت ماضی کی خوبصورت مگر اداس یادوں میں کھو گئے۔ کیسے کیسے فنکار آرٹسٹ یاد نہیں آئے۔ محمد حسین یاد آیا۔ آفتاب احمد، عقیل، موہنی حمید، شاد امرتسری، سلیم شاہد، اخلاق احمد دہلوی، سب یاد آئے۔ ایوب

رومانی یاد آئے۔ اسی کی یاد کے ساتھ کئی ایک رومان یاد آئے۔ بائیں جانب ایک چھوٹا سا تکونا سرسبز پلاٹ ہوا کرتا تھا جس کے کنارے کنارے جامن کے اونچے اونچے درخت اُگے تھے۔ برسات کے موسم میں یہاں ٹھیکیدار کے آدمی جھگی ڈال کر بیٹھ جاتے تھے۔ بڑی بڑی بانس کی سیڑھیاں لگ جاتی تھیں اور درختوں پر سے جامن اتارے جاتے تھے۔ اب وہاں صرف دو درخت دونوں جانب شور مچاتی سڑک کے درمیان حیران پریشان کھڑے تھے۔ پرانے ریڈیو سٹیشن کی عمارت کی جگہ اب ایک نئی کوٹھی بن چکی تھی۔

اشفاق نے مجھے وہ بلی یاد دلائی جو ریڈیو کی کینٹین میں بیٹھی رہتی تھی۔ کینٹین کا لڑکا چائے کا ٹرے لے کر جس کمرے میں جاتا بلی اس کے ساتھ ساتھ جاتی۔ وہاں ایک پرچ میں دودھ ڈال کر دیا جاتا جسے وہ بڑے شوق سے پیتی۔ ایک توبہ شکن انگڑائی لیتی اور واپس کینٹین کے کونے میں آ کر بیٹھ جاتی۔ مجھے دوسرے نامور موسیقاروں اور گلوکاروں کے ساتھ استاد برکت علی خان بھی یاد آئے جو بوسکی کا کھلا کرتہ' مخمل کا لاچہ باندھے تانگے میں سے بڑی درویشانہ بے نیازی سے اترتے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں سونے چاندی کی انگوٹھیاں چمک رہی ہوتیں۔ پھر ہم دونوں کو کالے خان صاحب یاد آ گئے۔ جو اپنی جوانی کے زمانے میں دن کے وقت دریائے راوی پر ریاض کرنے جایا کرتے تھے۔ پرانے ریڈیو سٹیشن کے زمانے میں وہ کافی معمر ہو گئے تھے۔ ہم دیر تک گاڑی میں بیٹھے ریڈیو سٹیشن کی پرانی یادوں کو زندہ کرتے رہے۔ اشفاق کہنے لگا۔

"تمہیں یاد ہے۔ یہاں سے ہی پہلی مرتبہ میں نے اپنا ریڈیو فیچر "تلقین شاہ" شروع کیا تھا۔"

وہاں سے نکل کر ہم ٹیلی ویژن سٹیشن والی سڑک یعنی ایبٹ روڈ پر آ گئے۔ یہاں گاڑیوں کا اس قدر رش تھا کہ گزرنا محال ہو رہا تھا۔ میں نے اشفاق کو وہ دن یاد کرایا جب میں قلعہ گوجر سنگھ والی سڑک سے نکل کر ایبٹ

روڈ کی ٹاہلیوں کے نیچے سے گزرتا پرانے ریڈیو سٹیشن کی طرف جا رہا تھا اور پیچھے سے اشفاق احمد سائیکل پر آ رہا تھا اور وہ میرے قریب آ کر سائیکل سے اتر گیا اور پھر ہم باتیں کرتے پیدل چل پڑے تھے۔

اشفاق احمد گاڑی بڑی آہستہ چلا رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے سڑک کے ٹریفک پر لگی تھیں۔ کہنے لگا۔

"یار! اس زمانے میں یہ سڑک کس قدر خاموش خاموش ہوا کرتی تھی۔"

اس زمانے میں سڑک کی دونوں جانب گنجان ٹاہلیوں کے درخت ہوتے تھے۔ ہوا ان درختوں میں سے گزرتی تو پتوں کے سرسرانے کی آواز آیا کرتی تھی۔ بہار کے زمانے میں ٹاہلیوں پر بور آتا تو سارا راستہ ان کی خوشبو سے مہک جاتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی تانگہ یا سائیکل سڑک پر سے گزرتا تھا۔

ہماری گاڑی لکشمی چوک کی ٹریفک لائٹس پر آ کر رک گئی تھی۔ میں نے بائیں جانب والی بلڈنگ کی بالکونی پر نگاہ ڈالی تو اشفاق فوراً سمجھ گیا کہ مجھے کیا یاد آیا ہے۔ کہنے لگا۔

"تمہیں ضرور غفور بٹ یاد آ گیا ہو گا۔"

غفور بٹ ہفت روزہ "سکرین لائیٹ" کا مالک اور ایڈیٹر تھا۔ دوسری منزل پر اس کا دفتر تھا جہاں ہم شاعر ادیب تقریباً روزانہ شام کو مل بیٹھتے تھے۔ ہم سب فاقہ مست ادیب تھے۔ اشفاق احمد بھی کبھی کبھی وہ بھی میرے اصرار پر یہاں آ جاتا۔ اشفاق احمد نے کہا۔

"وہ کیا چوکھٹا تھا جو غفور بٹ نے اپنے اخبار میں لگایا تھا؟ ذرا وہ بتاؤ۔"

بات یہ ہوئی تھی کہ مبارک سینما کے مالک ملک مبارک صاحب کا انتقال ہو گیا۔ غفور بٹ سیڑھیاں چڑھ کر ہانپتا ہوا آیا اور اپنے ایڈیٹر سے مخاطب ہو کر بولا۔

"تجمل! ملک مبارک کی وفات پر معذرت کا چوکھٹا لگانا نہ بھولنا۔"

تجمل نے جان بوجھ کر پوچھا۔

"معذرت کا چوکھٹا؟"

غفور بٹ بولا۔

"ہاں یار! وہی کہ ملک مبارک کے انتقال پر ادارہ سکرین لائیٹ ان کے لواحقین سے معذرت خواہ ہے۔"

غفور بٹ کو یاد کرتے ہوئے ہم نسبت روڈ کی طرف مڑ گئے۔ اب ہم "لیل و نہار" یعنی "پاکستان ٹائمز" والی بلڈنگ کی طرف جا رہے تھے۔ کبھی اس بلڈنگ میں روزنامہ "امروز" روزنامہ "پاکستان ٹائمز" اور ہفت روزہ "لیل و نہار" کے دفاتر ہوا کرتے تھے۔ یہاں بڑی مجلسیں لگا کرتی تھیں۔ پہلے امروز کے مولانا چراغ حسن حسرت ایڈیٹر تھے۔ پھر احمد ندیم قاسمی آگئے تو ادیبوں اور شاعروں کا رخ اس طرف ہو گیا۔ "لیل و نہار" کی ادارت اشفاق احمد کے پاس آئی تو اس کے دفتر میں بھی صبح شام ادیبوں کی رونق رہنے لگی۔ میں تقریباً روز "لیل و نہار" کے دفتر میں آجاتا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اشفاق کے سجے سجائے کمرے میں بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا اور اس کے بعد پاک ٹی ہاؤس کی طرف چل دیتا۔

سڑک پر گرد اڑ رہی تھی۔ گاڑیوں کا بے پناہ رش تھا۔ ہماری دائیں جانب پاکستان ٹائمز کی عمارت آگئی۔ یہ وہ عمارت نہیں تھی۔ اس عمارت کے کھنڈر کا کھنڈر تھا۔ باہر سے ہی چھتیں بیٹھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ جن پالش کی ہوئی فراخ سیڑھیوں پر سے ہو کر ہم اوپر جایا کرتے تھے ان سیڑھیوں پر خاک اڑ رہی تھی۔ سیڑھیاں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ ساری کی ساری بلڈنگ عبرت کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ جہاں سڑک کی جانب "لیل و نہار" کے دفتر ہوا کرتے تھے وہاں برآمدے کی کھڑکیاں بوسیدہ ہو کر نیچے کو جھک آئی تھیں۔ چھت کے ٹوٹے ہوئے پرنالے سے گرتے بارش کے پانی نے ساری دیوار کو

داغ دار کر رکھا تھا۔ پرنالے کے اوپر پیپل کی ٹہنیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔

"یہ تو عبرت کا مقام ہے۔"

اشفاق نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے تو یہ عمارت پہچانی نہیں جاتی۔"

"تم بڑی مدت کے بعد ادھر آئے ہو۔ اسی لئے میں تمہیں کہا کرتا ہوں کہ ان جگہوں پر آتے جاتے رہا کرو۔"

میں نے کہا۔

"چلو اب تمہارا "داستان گو" کا دفتر دیکھتے ہیں۔"

اشفاق کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ تھوڑی دیر کے لئے نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔

"وہاں بھی اب کیا رکھا ہے۔"

ہم ٹیلیگراف آفس کی بغلی سڑک سے نکل کر بڑے ڈاک خانے کے سامنے آگئے۔ وہاں اتنا رش تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔

"یہ اتنے سارے لوگ کہاں سے آگئے ہیں؟"

اشفاق کے اس سوال پر میں نے کہا۔

"یہی سوال میں نے ایک رکشا ڈرائیور سے کیا تھا۔ میں ریڈیو سٹیشن سے سمن آباد جا رہا تھا۔ گرمی بڑی سخت پڑ رہی تھی۔ مزنگ چونگی پر گاڑیوں کی لائن لگی تھی۔ ہمارا رکشا بھی سبز بتی کے انتظار میں لائن میں لگ گیا۔ میں نے رکشا ڈرائیور سے پوچھا کہ اتنے لوگ کہاں سے آگئے ہیں؟ اس پر رکشا ڈرائیور نے جواب دیا۔ آپ ان سب لوگوں کی مردم شماری کر کے دیکھیں اگر یہ دو ہزار آدمی ہیں تو ان میں سے ایک ہزار ساڑھے آٹھ سو آدمی دوسرے چھوٹے چھوٹے شہروں اور گاؤں کے ہوں گے۔ لاہور کے آدمی چند ایک ہی ہوں گے۔ باہر کے آدمیوں نے آ کر یہاں اتنا ہجوم کر

رہا ہے۔"

اشفاق بولا۔

"یہ بات کسی حد تک ٹھیک ہی لگتی ہے۔"

اشارہ کھل گیا۔ ہم نے گاڑی مال پر ڈال دی۔ بائیں جانب زیدی فوٹو گرافر کی دکان کو دیکھ کر اشفاق کہنے لگا۔

"یہ شخص بھی کمال کا فوٹو گرافر تھا۔ خدا کرے اب بھی ہو۔"

اس کے ساتھ والی دکان ہیئر ڈریسر کی تھی۔ مجھے یاد آگیا کہ قیام پاکستان کے زمانے میں میں اور انور جلال شمزا اسی دکان پر آکر بال بنوایا کرتے تھے۔ یہاں ایک کاریگر بڑے کمال کا ہوا کرتا تھا۔ ایسے بال بناتا تھا کہ بال چھوٹے بھی ہو جاتے تھے اور معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ حجامت کی گئی ہے۔ اس زمانے میں بال کٹوانے کے پانچ روپے لگتے تھے۔ اس سے ذرا آگے ایک اندر کو گئی ہوئی لمبی دکان تھی۔ یہ دکان ہمارے امرتسر کے ایک دیوہیکل کشمیری نوجوان بشیر کو الاٹ ہوئی تھی۔ یہ پنسلوں کاپیوں وغیرہ کی دکان ہوا کرتی تھی۔ دکان میں ابھی تک مال بھرا ہوا تھا۔ میں وہاں کبھی کبھی جاتا تو بشیر مجھے دیکھ کر بڑا خوش ہوتا۔ سب گھر والوں کی خیر خیریت دریافت کرتا۔ پھر دکان کی چھت تک چڑھے ہوئے لکڑی کے بھرے ہوئے خانوں پر ایک نظر ڈال کر کہتا۔

"سمجھ میں نہیں آتا اتنے سارے مال کو میں کیسے فروخت کروں گا۔ میں تو اس دکان کو ہی بیچ کر کشمیر چلا جاؤں گا۔ یہاں کیا پڑا ہے۔ گرمی ہی گرمی ہے۔"

اس سے ذرا آگے ایک دکان میں گارڈینیا نام کا ریستوران ہوا کرتا تھا۔ نیم روشن، ٹھنڈا ٹھنڈا ریستوران ——— بہت کم گاہک اندر بیٹھے ہوتے۔ بیرے چل کر میز کے پاس آتے تو ان کی آواز تک نہ آتی تھی۔ یہ ریستوران بھی ختم ہو گیا۔ وقت کی آندھی اسے بھی اڑا کر لے گئی۔ ہم ریگل سینما کا چوک کراس کر کے "داستان گو" والی ذیلی سڑک پر آئے تو یہاں گزرنے کے

لئے جگہ ہی نہیں تھی۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

"گاڑی ریگل سینما کے احاطے میں لگا دو یہاں سے پیدل چلتے ہیں۔"

اس نے یہی کیا۔ ریگل سینما کے باہر اگر کوئی شے ویسی کی ویسی تھی تو وہ پھول بیچنے والوں کی گلاب، گیندے اور دوسرے رنگ برنگ پھولوں سے بھری ہوئی باٹیاں تھیں۔ آج سے چالیس سال پہلے بھی ان پھول بیچنے والوں کے پاس کوئی دکان نہیں تھی۔ ریگل سینما کے گیٹ کے باہر پھولوں کی ٹوکریاں اور باٹیاں سجا کر بیٹھے ہوتے تھے اور آج بھی وہ اسی طرح فٹ پاتھ پر بیٹھے پھول بیچ رہے ہیں۔ ریگل سینما کے گیٹ کی دوسری طرف جہاں اب کتابوں کی دکان ہے کبھی شیراز ریستوران ہوا کرتا تھا۔ یہاں کبھی کبھی میں اور اشفاق آ کر چائے پیا کرتے تھے۔ پھر اس کا نام پارز کیفے ہو گیا۔ اس کا مالک پال نام کا ایک بھاری بھرکم باکسر ٹائپ کا آدمی ہوا کرتا تھا۔ جو شام کو ریستوران کے باہر کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ دوسری کرسی پر ٹانگیں پھیلا دیتا اور مال پر کبھی کبھی گزرنے والی موٹر کاروں کو تکتا رہتا۔ پھر نہ جانے وہ کہاں غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھ سفید ساڑھی اور اداس چہرے والی ایک خاتون بھی بیٹھا کرتی تھی۔ وہ بھی پھر نظر نہیں آئی۔ اس کے آگے ایک بڑا سٹور ہے۔ یہاں پہلے سٹینڈرڈ ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس ہوٹل کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں پہلے پہل انیلا نام کی ڈانسر ڈانس کیا کرتی تھی۔ انیلا بعد میں میٹرو ہوٹل میں ڈانس کرنے لگی تھی۔ سٹینڈرڈ ہوٹل میں شراب کے جام بھی چلتے تھے۔ شراب سے مجھے یاد آ گیا۔ گوالمنڈی کے چوک میں ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد ہم یہاں آئے تو میں نے دیکھا کہ اس ہوٹل کے باہر ایک بورڈ لگا تھا جہاں اردو میں لکھا ہوا تھا۔

"یہاں بیٹھ کر شراب پینے کی اجازت ہے۔"

اسی طرح جی پی او کے سامنے لائیڈز بنک والی بلڈنگ کے اوپر بہت بڑا

نیون سائن لگا تھا جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔

"مری، بیئر بہترین بیئر ہے۔"

اب نہ وہ مری کی بیئر رہی' نہ سٹینڈرڈ ہوٹل رہا' نہ سٹینڈرڈ ہوٹل کی ڈانسر انیجلا ہی رہی۔ جو رہی تو بے خبری رہی۔

ہم پھول بیچنے والوں کے پھولوں سے جدا ہو کر داستان گو دفتر کے سامنے والے بس سٹاپ پر آ کر ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اشفاق ہنس پڑا۔

"یار! ہمارا چھوٹا سا شاہ نشین ٹائپ کا دفتر تو بالکل ہی ویران ہو گیا ہے۔"

وہاں خدا جانے کس نے اپنا دفتر یا دفتر کا گودام بنایا ہوا تھا۔ دفتر کی تنگ سیڑھیاں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ یہ سیڑھیاں دوسری منزل پر روزنامہ "آفاق" کے دفتر کو بھی جاتی تھیں۔ یہ 1952ء کی بات ہے۔ میں روزنامہ "آفاق" کے دفتر میں ملازم ہو گیا تھا۔ پہلے میری ڈیوٹی دن کے وقت اخبار کے دوسرے تیسرے صفحے پر ہوا کرتی تھی۔ میرے ساتھ ناصر کاظمی اور علی سفیان آفاقی بھی ہوا کرتے تھے۔ "آفاق" اخبار میں آفاقی کے نام سے کالم لکھا کرتا تھا۔ پھر میں رات کی شفٹ میں چلا گیا۔ یہ ختم نبوت کی تحریک کا زمانہ تھا جب مال پر بڑی گولی چلی تھی۔ رات کو کرفیو لگتا تھا۔ میں نے پاس بنوا رکھا تھا۔ پھر بھی رات کو ایک بجے گھر واپس جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ کسی طرف سے کوئی گولی نہ آ جائے۔ اشفاق نے سر کو ہلکا سا جھٹک کر کہا۔

"چلو یار! واپس چلتے ہیں۔ ان کھنڈروں میں کب تک پھرتے رہیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ابھی ایک تاریخی کھنڈر کی سیر باقی ہے۔"

"وہ کونسا کھنڈر ہے؟"

"پاک ٹی ہاؤس۔"

اشفاق بے اختیار خوش ہو کر بولا۔

"ہاں یار! وہاں ضرور چلیں گے۔ چلو۔"

ہم نے گاڑی نکالی اور پاک ٹی ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ پاک ٹی ہاؤس کے سامنے جو درخت تھا وہ پہلے سے بہت بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی گھنی شاخوں نے سڑک پر سایہ کر رکھا تھا۔ ٹی ہاؤس بھی زبان حال سے اپنی خستگی و شکستگی کی داستان سنا رہا تھا۔ فرش کی ٹائلیں جہاں سے اکھڑ گئی تھیں وہاں پلستر پھیر دیا گیا تھا۔ چند ایک میزوں پر اجنبی چہروں والے لوگ بیٹھے تھے۔ سراج صاحب کے بیٹے نے ہمیں پہچان لیا۔ وہ کاؤنٹر چھوڑ کر ہمارے پاس آیا۔ اس کا چہرہ وفور مسرت سے چمک رہا تھا۔

"زہے نصیب کہ آپ پاک ٹی ہاؤس میں آئے۔"

میں نے کہا۔

"یار! چائے وہی پرانے پاک ٹی ہاؤس والی پلانا۔"

"اس سے بھی اعلیٰ چائے آئے گی۔"

پھر اس نے کسی بیرے کو آواز دی۔ بیرا آ گیا۔ کسی پرانے بیرے کی صورت اس میں نظر آ رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ لال نامی بیرے کا بیٹا ہے۔ وہ بڑے اہتمام سے چائے بنا کر لایا۔ مگر یہ وہ چائے نہیں تھی جو کبھی ہم وہاں پیا کرتے تھے۔ اشفاق شیشے کی دیوار والی سیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں یاد ہے یہاں شہرت بخاری' قیوم نظر' حبیب جالب' انجم رومانی اور امجد الطاف بیٹھا کرتے تھے۔"

ہم کاؤنٹر کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔

"اور یہاں ناصر کاظمی میرے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ بیٹھتا وہ بھی قیوم نظر والی ٹولی میں تھا مگر جس روز اس نے تازہ غزل کہی ہوتی تھی تو مجھے ساتھ لے کر اس میز پر آ جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی ہوتی تھیں۔ وہ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ لگا کر مجھے کہتا۔ تمہیں

اپنی تازہ غزل سناتا ہوں ———"

میں نے اوپر گیلری کو جاتے زینے کو دیکھا۔ زینہ خالی تھا اور گیلری بھی خالی تھی۔ زینے کے پاس بھی ایک میز لگی تھی۔ مجھے یاد آ گیا۔ ایک بار گرمیوں کی دوپہر کو میں اس میز پر بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ شہرت بخاری' قیوم نظر اور محمود جیلانی نامی ایک سٹوڈنٹ بھی تھا جس کا تعلق منٹگمری سے تھا اور جو گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا اور گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل میں ہی رہتا تھا۔ محمود جیلانی بڑا ادب پرست نوجوان تھا۔ اتنے میں پاک ٹی ہاؤس کا دروازہ کھلا اور سعادت حسن منٹو نے اندر جھانک کر دیکھا۔ یہ منٹو صاحب کی زندگی کے آخری افسوسناک ایام تھے۔ یہ منظر پورے کا پورا مکمل تفصیل کے ساتھ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ شہرت بخاری نے منٹو صاحب کو دیکھا تو گھبرا کر کہا۔

"اوئے منٹو صاحب آ گئے' بھاگو' وہ پیسے مانگیں گے۔"

قیوم نظر اور شہرت بخاری جلدی سے اٹھ کر اوپر گیلری میں چلے گئے۔ میں اور محمود جیلانی وہیں بیٹھے رہے۔ اس دوران منٹو صاحب ہماری میز پر پہنچ گئے تھے۔ غالباً وہ محمود جیلانی کو دیکھ کر وہاں آئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی محمود جیلانی سے پوچھا۔

"تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟"

محمود جیلانی نے بڑے ادب سے بٹوہ کھول کر ان کے آگے رکھ دیا اور کہا۔

"منٹو صاحب! یہ سارے پیسے آپ ہی کے ہیں۔"

مجھے یاد ہے بٹوے میں دس روپے کے کتنے ہی نوٹ ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے۔ منٹو صاحب نے ان میں سے صرف دو نوٹ نکال کر رکھ لئے اور کہا۔

"بس بیس روپے کافی ہیں۔"

اور جن قدموں سے چل کر وہاں آئے تھے انہی قدموں سے چلتے ٹی ہاؤس سے باہر نکل گئے۔ ان دنوں جم خانہ شراب کا ادھا چودہ روپے میں آیا کرتا تھا۔ ہم دیر تک ٹی ہاؤس میں بیٹھے گزرے زمانے کو' گزرے ہوئے زمانے کے چہروں کو یاد کرتے رہے۔ کیسے کیسے لوگ تھے۔ کیسے کیسے چمکیلے چہرے تھے جو ادب کے آسمان پر ستارے بن کر چمکے اور پھر اپنے پیچھے روشنی کی لکیریں چھوڑ کر نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئے۔ کبھی ٹی ہاؤس کے کاؤنٹر پر رکھے گلدان میں نرگس اور گلاب کے پھول مہکا کرتے تھے۔ شیشے میں سے ان پر سردیوں کی دھوپ پڑتی تو وہ بجلی کے بلب کی طرح روشن ہو جاتے۔ اب کاؤنٹر پر نہ گلدان ہے نہ گلدان کے پھول ہیں۔ صرف میں اور اشفاق احمد میز کے آمنے سامنے سر جھکائے بیٹھے پرانے دنوں کو یاد کر رہے ہیں۔ ایک دن آئے گا کہ اس میز پر کوئی اور بیٹھا ہمیں یاد کر رہا ہوگا۔

اے حمید

26-7-95